راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

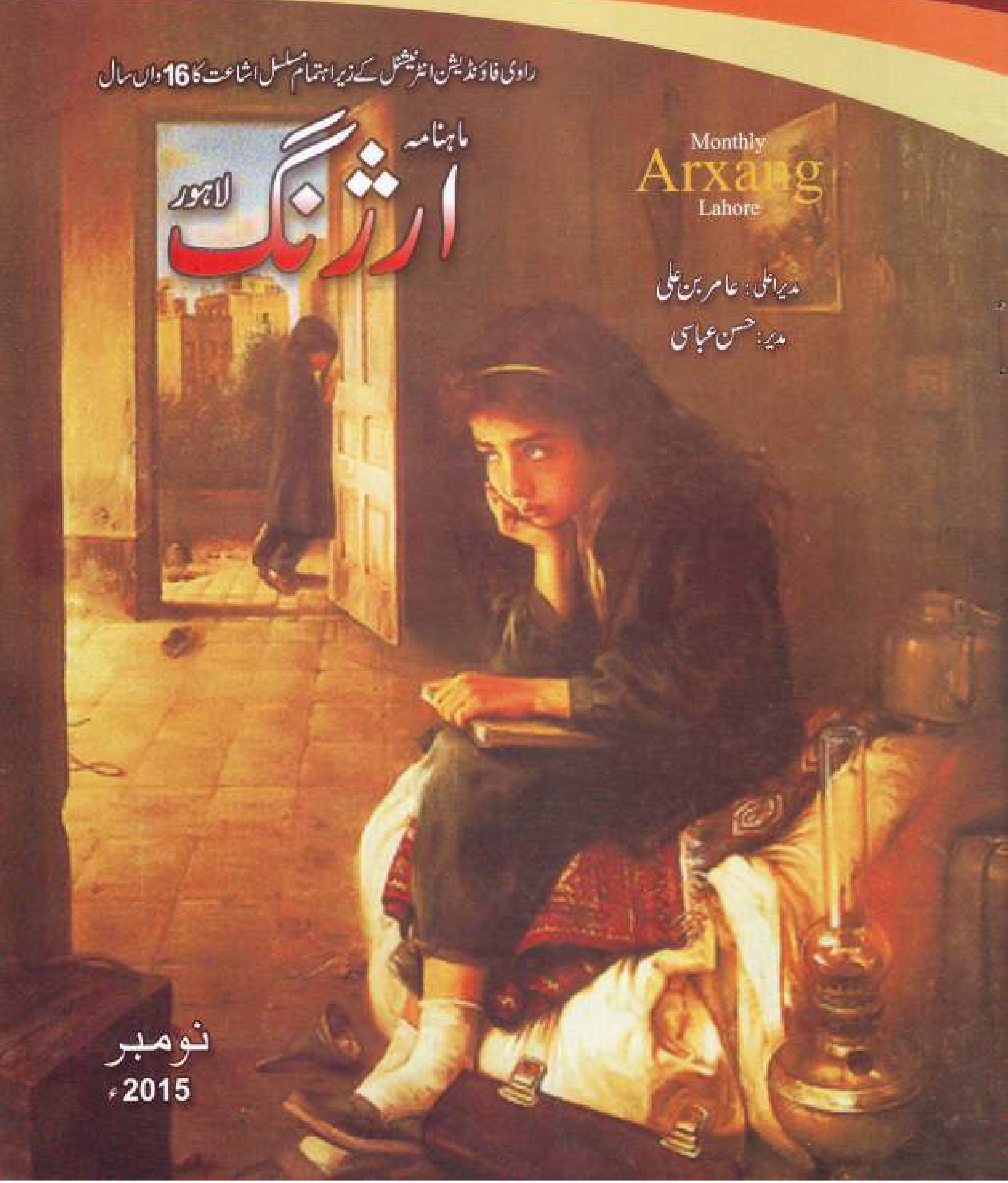

نومبر

2015ء

معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والی اُلجھن کا شکار ہے جس سے عدم تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے۔

جب سے الیکٹرک میڈیا نے سر اُٹھایا ہے مطالعہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے

ممتاز شاعر اقبال راہی سے عامر بن علی کی گفتگو

ارژنگ: ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

اقبال راہی: ہماری رہائش انارکلی بازار میں تھی۔ پیسہ اخبار میں ایک کارپوریشن کا اسکول تھا پانچویں جماعت وہاں سے پاس کی۔ اس کے بعد دیگر اسکولوں میں زیر تعلیم رہے۔ مگر ساتویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔

ارژنگ: شاعری کی طرف کس طرح آنا ہوا؟

اقبال راہی: ہم چونکہ نامور شاعر حضرت احسان دانش کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے اور بچوں کی نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ ایک شاعر آغاز برنی ہمیں احسان دانش صاحب کے پاس لے گئے اور ہمیں ان کے حوالے کر دیا۔ بس یہیں سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ یہ ایک درسگاہ تھی جہاں سے ہم نے فیض حاصل کیا۔ بعد میں ہم نے باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کی۔

ارژنگ: آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے شعر لکھ لیتے ہیں۔

اقبال راہی: دراصل ہمارے دور میں اساتذہ اپنے شاگردوں کو مشق کراتے تھے۔ ہمیں احسان صاحب کوئی مصرعہ دے کر کہتے تھے اس پر جتنے شعر لکھ سکو لکھ کر لاؤ۔ چونکہ نیا نیا شوق تھا ہم ساری رات بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ جب جا کر سناتے تھے تو تین چار مصرعے سننے کے بعد استاد کہتے تھے انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینک آؤ۔ اس وقت اگرچہ ناگواری کی ایک کیفیت دل و دماغ پر طاری ہوتی تھی لیکن اب یہ کھلا کہ یہ ذہنی تربیت تھی اور اب ہم اس حوالے سے ہر جگہ مقبول ہیں۔

> **جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ نئی نسل تک منتقل نہیں ہو پا رہا۔**

ارژنگ: کس کس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

اقبال راہی: پہلے مقبول جہانگیر مرحوم نے امروز کے لیے بچوں کی نظمیں لکھوائیں۔ پھر مزاحیہ شاعری کا چکر لگا۔ پھر قطعہ نگاری کی طرف آئے۔ اب نثر کے میدان میں بھی کوشش جاری ہے۔

ارژنگ: کبھی پاکستان سے باہر کسی مشاعرے میں جانا ہوا؟

اقبال راہی: بچپن میں ایک کہاوت سنتے تھے۔ چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ۔ دال کو پھر کون لگاتا ہے ہاتھ۔ تو جناب ہم بڑے سفید پوش آدمی ہیں ہمیں کون پوچھتا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے دانشوروں کا ہولڈ ہے جسے وہ چاہتے ہیں بھیج دیتے ہیں یا ساتھ لے جاتے ہیں۔

ارژنگ: نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال راہی: میرے خیال کے مطابق جو شاعر بحر اور وزن کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ اپنے لیے یہ

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور
جلد نمبر ۱۷

شمارہ نمبر ۱۰
جلد نمبر ۱۷

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

نگرانِ اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

نائب مدیران: قمر ریاض (مسقط)، نازادو کاڑوی

مدیرانِ معاون: شازیہ نورین (جرمنی)، بدر سیماب (کویت)

مجلسِ مشاورت ⊙ محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ سعدیہ سیٹھی (برطانیہ)

قانونی مشیر ⊙ قانونی مشیر: افتخار شوکت چودھری 0321-6012211

رنگ دوست ⊙ ایلا بخار (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (امریکہ) ⊙ اسد رضوی (امریکہ) ⊙ ارشد ندیم ساحل (کینیڈا)

کمپوزنگ ⊙ زریاب کمپوزنگ : 0321-4730769 نوازکار ⊙ نعمان حسن :0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 نازادو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

اندرون ملک (پاکستان) 1000 روپے • اندرون بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ: 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

حمد، نعت، سلام / ۶-۳

مضامین: ○ شاعری میرا پیشہ ہے / پابلو نرودا، ترجمہ: کشور ناہید ' ۷

○ عادہ گزر کا سفر / ڈاکٹر وحید الرحمان خانؔ ۱۱-۱۰

○ علیم قریشی کی شاعری / فرحت زاہد ' ۱۲

○ عہد ساز شاعر..... منیر نیازی / محمد ایوب صابر ' ۱۳

○ اپنے استنبول میں / منصف ہاشمی ' ۱۵

○ حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ کلام "سائیں" / محمد نوید مرزا ' ۱۵

○ نور برحق کے جلووں میں گم شاعر / محمد امین ساجد سعیدی ' ۱۸

مضامین: ○ کیا ہو گے؟ / عطاء الحق قاسمی ' ۲۰

○ آل ویز ویلکم / حافظ مظفر محسن ' ۲۱

کالم: ○ سلام / امجد اسلام امجد ' ۲۳

کیا ہم سچ میں آزاد ہیں / ہیبہ زاہد ' ۲۴

متفرق شاعری: ۳۲-۲۶

سمندر پارے: ۲۳

افسانے: دشتِ زندگی / آسناتھ کنول ' ۳۳

○ جیالا / گل زیب عباسی ' ۳۷

○ دبئی اور یورپ میں چند روز / حسن عباسی ' ۴۱

○ انٹرویو سعدیہ سیٹھی ' ۴۵

شاعری (غزل، نظم) ' ۴۶

مختصر ادبی خبریں / تقریبات ' ۴۸

تبصرہ کتب / الیپ آرا ' ۵۱

○ نامہ ہائے احباب ' ۵۶

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد (پہلے حمدیہ شعری مجموعے "سائیں" سے تیسری حمد)

حسن عباسی/لاہور

جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اُسی کی کمائیاں سائیں

بادشاہی تجھی کو زیبا ہے
اور ہم کو گدائیاں سائیں

تیرے گرتے پہ روزِ اوّل سے
ہو رہی ہیں کڑھائیاں سائیں

آسماں پر بغیر ڈوری کے
کیا پتنگیں اُڑائیاں سائیں

تیرا نظارہ ہی نظر آیا
جس سے نظریں ملائیاں سائیں

ہو گئے ہم تو اجنبی خود سے
جب ہوئیں آشنائیاں سائیں

ننھے ہاتھوں سے کیسے لکھیں ہم
مرتبے اور بڑائیاں سائیں

کس کی سرشاریاں مرے اندر
عشق بن کر سمائیاں سائیں

تیرے ناموں کی اپنے ہونٹوں سے
ہم نے بانٹی مٹھائیاں سائیں

کیسے پہنچیں فلک تلک اپنی
ہیں دُعائیں ہوائیاں سائیں

جتنے جتنے ترا کرم جو ہوا
اپنی آنکھیں بھر آئیاں سائیں

ایک دھڑکا لگا رہا دل کو
جب بھی خوشیاں منائیاں سائیں

جنگ کے موسموں میں رکھی ہیں
کیوں ہماری سگائیاں سائیں

اس طرح سے کبھی ہماری سُن
جیسے تو نے سُنائیاں سائیں

پہلے دن سے خراب موسم میں
ہم نے فصلیں اُٹھائیاں سائیں

تیری بخشی ہوئی سبھی چیزیں
کیوں لگی ہیں پرائیاں سائیں

نسل در نسل بین ہوتے ہیں
مدتوں کی دُہائیاں سائیں

ہم سے برداشت ہو نہیں سکتیں
تاقیامت جدائیاں سائیں

پھیر جاتا ہے کون آنکھوں میں
رت جگوں کی سلائیاں سائیں

ناتوانوں کے حصے میں آئیں
کیوں مسلسل چڑھائیاں سائیں

تیرے پیاروں کے پڑ گئی ہیں گلے
ہم مصیبت کی جائیاں سائیں

جانتے ہیں کہ ملنے والی نہیں
کبھی ہم کو رہائیاں سائیں

کھیلنے کے جو دن تھے اُن میں بھی
ہم نے اینٹیں اُٹھائیاں سائیں

پھر رہے ہیں تجھے گلیوں میں
کر کے اتنی پڑھائیاں سائیں

چننی پڑتی ہیں تیرے بچوں کو
کتنی کڑوی دوائیاں سائیں

وقت اُستاد ہے بڑا ظالم
دیکھ اس کی پٹائیاں سائیں

مر چلے ہم تو پار کرتے ہوئے
روز و شب کی یہ کھائیاں سائیں

ذرّے ذرّے میں ہے ظہور ترا
اس قدر خود نمائیاں سائیں

اس قدر بے نیازیاں توبہ
اتنی بے اعتنائیاں سائیں

ایسا لطف و سرور تھا اُن میں
آیتیں گنگنائیاں سائیں

یونہی کھیلے گا کب تلک آخر
ہم سے چھپن چھپائیاں سائیں

اتنی باتیں ہمیں پتہ ہیں فقط
جتنی تو نے بتائیاں سائیں

ناسمجھ تھے کہ تیرے کاموں میں
یونہی ٹانگیں اڑائیاں سائیں

جب بھی آسانیوں کی کوشش کی
مشکلیں ہی بڑھائیاں، سائیں

کھو گیا کچھ نہ کچھ ضرور اپنا
جب بھی نظریں ہٹائیاں سائیں

پھر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا
گردنیں جب جھکائیاں سائیں

بادلوں کی گرج چمک کے ساتھ
ہو رہی ہیں کٹائیاں سائیں

جب اُجڑنا تھا ان کی قسمت میں
بستیاں کیوں بسائیاں سائیں

ہر دفینے سے نکلا اپنا وجود
کی ہیں جتنی کھدائیاں سائیں

ہم تو پہلے ترے قفس میں تھے
بجلیاں کیوں گرائیاں سائیں

تیرے آرے کی لکڑیاں ہیں ہم
جس طرح کر "چرائیاں" سائیں

آپ ہی بھر گئے ہیں زخم اپنے
کون کرتا سلائیاں سائیں

زندگی کیا کہ ریت پہ ہم نے
کشتیاں ہیں چلائیاں سائیں

تیری چکی پہ دوسروں کی ہم
بھر رہے ہیں پسائیاں سائیں

صاف دکھتی ہیں اپنے چہروں پہ
ہجر چندرے کی چھائیاں سائیں

کیا ہوا ہے کہ کھنچتی جاتی ہیں
بادلوں کی چٹائیاں سائیں

آنسوؤں میں ہی بہہ گئیں اپنی
روز و شب کی کمائیاں سائیں

زندگی سے گزارہ مشکل تھا
پھر بھی ہم نے نبھائیاں سائیں

یہ محبت اور اس کی سب چالیں
کس نے ہم کو سکھائیاں سائیں

کیسے کیسے چلائے ہیں مُہرے
کیا بساطیں بچھائیاں سائیں

تیری خاطر ہم اپنی کرتے ہیں
کیسی کیسی برائیاں سائیں

حمد (پہلے حمدیہ شعری مجموعے "سائیں" سے تیسری حمد)

حسن عباسی/لاہور

ہم اناڑی ہیں تو کیسے سہیں
زندگی کی رضائیاں سائیں

خود کو تھوڑا بدلنا چاہتا ہوں
کہاں بنتی ہیں ڈائیاں سائیں

ایک چہرے کی آڑ میں تو نے
کتنی نیندیں چرائیاں سائیں

سرخ رُو ہو گئے ترے پیارے
ہوں بہت ہی بدھائیاں سائیں

تیرے میلے میں خود کو گم کرنے
پار دریا سے آئیاں سائیں

خواہشوں کی پنیریاں دل میں
تو نے خود ہی لگائیاں سائیں

اُلٹے توے پہ روٹیاں ہم نے
زندگی بھر پکائیاں سائیں

خواہشیں گیلی لکڑیوں کی طرح
میرے اندر جلائیاں سائیں

ہم نے دیا کیا کہ جیسی ہمیں
تو نے باتیں بجھائیاں سائیں

رات کٹتی نہیں ہے کٹ کر بھی
دن ہیں جیسے دہائیاں سائیں

تیز طوفان تیز بارش نے
صرف جُھگیاں گرائیاں سائیں

زخمی پوریں، پھٹا لباس، کپاس
اور مسلسل چُنائیاں سائیں

کتنی عیدیں گزر گئیں اپنی
وہی خالی کلائیاں سائیں

زندگی کی پتنگ پر ہم نے
چیپیاں ہی لگائیاں سائیں

وقت آگے ہوا نہ پیچھے ہوا
سوئیاں تو گھمائیاں سائیں

ہم تماشے کی پتلیاں تو نے
جب بھی چاہا نچائیاں سائیں

تیری خاطر ہیں سارے جوگ اپنے
دھونیاں ہیں رمائیاں سائیں

اب تو اپنا دکھا دے رنگ ہمیں
ہو چکیں جگ ہنسائیاں سائیں

زہر دینے سے پہلے تو نے ہمیں
لذتیں کیا چکھائیاں سائیں

پھر کسی نے اُٹھا دیے پنچھی
جب بھی آنکھیں ٹکھائیاں سائیں

تیرے تالاب میں سدا اپنی
سوکنیں ہی نہائیاں سائیں

دو دلوں تک ہی کیوں نہیں رہتیں
دو دلوں کی لڑائیاں سائیں

زیست کی پٹریوں پہ درج نہیں
فاصلوں کی اکائیاں سائیں

اتنی کڑوی دوائیاں ہم کو
اپنے ہاتھوں پلائیاں سائیں

اُن کا رب کون ہے؟ جو سڑکوں پر
کام کرتی ہیں مائیاں سائیں

کچھ تو اُن کو بتا کہاں جائیں
جو ہیں تیری ستائیاں سائیں

کس لیے آنسوؤں کو بخشی ہیں
اس قدر بے نوائیاں سائیں

گھنٹیاں تھیں ہزار مجھ میں خموش
کس نے آ کر بجائیاں سائیں

ایک اک کر کے اپنے ہاتھوں سے
خواہشیں سب دبائیاں سائیں

قدر کیا ہو کہ تیری محفل میں
آ گئیں بن بُلائیاں سائیں

آسمانوں سے تو نہیں اُترا
یونہی آنکھیں تھکائیاں سائیں

تیرے ہوتے بھی تیری دُنیا میں
ہو رہی ہیں خدائیاں سائیں

کاغذی کشتیاں سمندر میں
کس لیے ہیں چلائیاں سائیں

ٹاکیاں بن گئے ہیں ہاتھ اپنے
کرتے کرتے صفائیاں سائیں

آنسوؤں سے لگائیاں ہم نے
آنسوؤں سے بجھائیاں سائیں

اپنی جلتی ہوئی سبھی چیزیں
کیوں ہمیں ہیں تھمائیاں سائیں

تیرا بھٹ ازل سے چلتا ہوا
اور اپنی تھپائیاں سائیں

تو نے ہم سے، ہمارے بچوں سے
محنتیں ہی کرائیاں سائیں

اُس پہ بھی اس قدر حساب کتاب
دو گھڑی جھلائیاں سائیں

دُکھ بھری اور عذاب تو نے
قسمیں کیا کیا [illegible]

تیری بارش نے [illegible]
حق سمجھ کر گرائیاں سائیں

اپنے ہاتھوں سے اب نہیں ہوتیں
اور تیری بنائیاں سائیں

میرے کھاتے میں ڈال دی ہیں کیوں
اپنی سب کج ادائیاں سائیں

سامنا تجھ سے ہو گیا میرا
جس سے نظریں ملائیاں سائیں

کیسا لگتا ہے جب تری جانب
اُٹھتی ہیں چارپائیاں سائیں

تیرا کاغذ تری مشقیں ہیں
اور تیری چھپائیاں سائیں

جو مرے بس میں تھا کیا میں نے
عمر بھر تلملائیاں سائیں

کھیل میں کوئی موڑ پیدا کر
آ رہی ہیں جمائیاں سائیں

حمد

(معروف شاعر حسن عباسی کی زمین میں)

تیری قدرت دیکھی سائیں
میں نے کھڑکی کھولی سائیں
تیرا شکر ادا کرتا ہوں
گزرے اپنی جیسی سائیں
تو ہی میرا ساجن ساتھی
تو ہی بنائے بگڑی سائیں
تیرا ذکر ہے گلیاں کوچے
تو ہی بستی بستی سائیں
محفل محفل ساز بکھیرے
تیرے نام کی جگنی سائیں
میں ہوں تیری خاطر بن میں
گھوموں بن کے جوگی سائیں
تیرا بھجن ہے سائیں سریلا
تیری حمد ہے میٹھی سائیں
چن کر لفظ یہ لکھنے جو گے
میں نے حمد ہے لکھی سائیں
تیری مدد سے نظم یہ لکھی
اپنی کیا ہے ہستی سائیں
تیرے کرم سے پاتا ہوں میں
دونوں وقت کی روٹی سائیں
اس پہ تیرا فضل و کرم ہو
میرا گاؤں ہے بوئی سائیں
کام ہے میرا حسرت والا
اپنی مشقت چکی سائیں
سبزہ سبزہ میری زمیں ہو
فصل بھرے یہ ڈوگی سائیں
تیری دیا سے میری قسمت
سوئی سوئی جاگی سائیں
ہمت اپنی عرش منارے
وردی میری خاکی سائیں
تیرے لفظ ہیں کاغذ کاغذ
لکھیں بول لکھاری سائیں
شانِ رسالتؐ قائم رکھیو
منکر کی ہو سبکی سائیں
تیری یاد میں ثاقب کی ہیں
آنکھیں بھیگی بھیگی سائیں

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

حمدِ باری تعالیٰ

مرے تو مان سبھی رب کارساز رکھے
وہ شانِ کبر مجھے سب سے بے نیاز رکھے
وہ نورِ ارض و سما منکشف بھی راز رکھے
ہے شاہ رگ سے قریں، پھر بھی احتراز رکھے
گمان میں ہو تو تسلسل سے رحمتیں برسیں
وہ نام وردِ زباں ہو تو دل گداز رکھے
ازل سے حق کی صداقت پہ جو رہا فائز
اماں میں، حشر کے دن بھی وہ دل نواز رکھے
نظر میں نور، دہن میں زباں، تری بخشش
بدن میں روح کوئی منطقی جواز رکھے
جبیں پہ داغ بہت اور میں تہی دامن
ہم عاصیوں کا بھرم اے خدا نماز رکھے

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

نعت

مل جائے اگر نعت کا انمول خزینہ، اے شاہِ مدینہؐ
آ جائے ہمیں زندگی کرنے کا قرینہ، اے شاہِ مدینہؐ
ہر چند ہے قسامِ ازل رازقِ اکبر، جس کا نہیں ہمسر
دیتا ہے توسّل سے ترےؐ نان شبینہ، اے شاہِ مدینہؐ
سیرت ہے تری مصحفِ قرآن کی تنویر، آیات کی تفسیر
ہے نام ترا ؐ جیسے انگوٹھی میں نگینہ، اے شاہِ مدینہؐ
اے کاش کہ مل جائے مجھے حسنِ بصیرت، پا جاؤں حقیقت
اے کاش کہ مل جائے مجھے دیدۂ بینا، اے شاہِ مدینہؐ
ہو کر تری سنت سے یہ ہر گام گریزاں، ہیں ششدر و حیراں
گرداب میں ہے اُمتِ عاصی کا سفینہ، اے شاہِ مدینہؐ
جس دین پہ قربان ہوئی آلِ مطہر، اے شافعِ محشرؐ
ہو اس کے لیے ہی مرا مرنا مرا جینا، اے شاہِ مدینہؐ
ہر سُو ہے جہاں رقص کناں بادِ بہاری، ہے کیف سا طاری
تم سے دلِ خورشید ہے گلزارِ مدینہ، اے شاہِ مدینہؐ

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

نعت

قلب و جاں کا نصاب مہکا ہے
کیا مدینہ گلاب مہکا ہے
آپ کی یاد کی کلی چٹکی
دل مرا بے حساب مہکا ہے
ایسی ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں
دشت بھیگا سراب مہکا ہے
آپ کے فیض سے مرے آقا
یہ فلک کا حباب مہکا ہے
پاک تلووں سے لمسِ عالی سے
حسنِ آب و تراب مہکا ہے

حمد، نعت، سلام

سیرتِ مصطفیٰ کی نسبت سے
زیست کا باب باب مہکا ہے
پھر رضا نور کی ہوئی بارش
پھر کرم کا سحاب مہکا ہے

رضاء اللہ حیدر

دل میں جب سے غمِ شبیرؑ بسائے ہوئے ہیں
قابلِ رشک مقدر کو بنائے ہوئے ہیں
مدحتِ سبطِ پیمبرؐ میں جو مصروف ہیں ہم
پھول یہ اُن کی محبت کے کھلائے ہوئے ہیں
دھیان ہٹتا ہی نہیں کرب و بلا سے میرا
اس طرح سے وہ مرے ذہن پہ چھائے ہوئے ہیں
آخرت میں مری بخشش کی ضمانت ہوں گے
یہی آنسو جو مری آنکھ میں آئے ہوئے ہیں
اُن مصائب کی کہانی مجھے بھولے کیسے
جن کے منظر مری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں
حوصلہ دیکھ براہیمؑ! مرے مولاؑ کا
نوجواں بیٹے کے لاشے کو اُٹھائے ہوئے ہیں
گو بہت دور ہیں ہم روضۂ زینبؑ سے رضا
اُن کی یادوں کے دیے گھر میں جلائے ہوئے ہیں

علی رضا

مرثیہ

شوق شہادت مچل رہا ہے چہرہ چہرہ روشن ہے
صحرا میں اک بجھے چراغوں والا خیمہ روشن ہے
چاروں اور اُمڈ آئے ہیں ظلمت کے طوفان مگر
مصباح الہدایت لیکن ان میں تنہا روشن ہے
اصغرؑ کے معصوم لہو سے وادی مہکی مہکی ہے
اکبرؑ کی نوری صورت سے پورا صحرا روشن ہے
اب بھی چراغ راہ بنے ہیں نقشِ پائے مولا حسینؑ
اب بھی حق اور سچ کی منزل کا ہر رستہ روشن ہے
یوں تو لاتعداد ہیں سجدے وقت کے چہرے پر لیکن
زخمی پیشانی کا خون آلودہ سجدہ روشن ہے
دل میں کاشفؔ سوگ بسا ہے، جگر میں بھی اک روگ لگا ہے
اندر قبرِ حسینؑ کی لو ہے میرا سینہ روشن ہے

ہدایت حسین کاشف/آدم والی

سلام

طلب رکھتا نہ تھا اک بوند بھی شبیرؑ پانی کی
مگر ہاری ہوئی تھی اُس گھڑی تقدیر پانی کی
کبھی اے کاش وہ تشنہ لبوں کے کام آ جاتا
بدل جاتی ہمیشہ کے لیے تاثیر پانی کی
پہنچ سکتا تو پل بھر میں وہ پیاسوں تک پہنچ جاتا
لہو آنسو رُلاتی ہے مجھے تاخیر پانی کی
قدم رکھ کر یہاں سے کربلا کی سمت جاتے ہیں
سبھی مل کر بناتے ہیں کوئی زنجیر پانی کی
یہیں سے چشمہ آبِ رواں باہر نکلتا ہے
اسی مٹی سے مل کر نہر کوئی چیر پانی کی
کبھی اُس کا گزر بھی کربلا کی خاک سے ہوتا
زمانے بھر میں ہوتی کس قدر توقیر پانی کی

محمد نوید مرزا/لاہور

سلام

سوچ، عقل و فہم، الفاظ و معانی سے الگ
کربلا تیری کہانی ہر کہانی سے الگ
جو سرِ نیزہ بھی قرآں کی تلاوت کر گیا
مرتبہ اُس کا زباں کی ترجمانی سے الگ
یہ عزاداروں کا لشکر رُک نہیں سکتا کبھی
ماتمی ملبوس میں ہیں زندگانی سے الگ
اے خدا ان پیاس کے مارے ہوؤں کی خیر ہو
کیا کوئی انسان رہ سکتا ہے پانی سے الگ
اس سے بڑھ کر ظلم کی ملتی نہیں کوئی مثال
ریت کے صحرا پہ تشنہ لب تھے پانی سے الگ
یاد جب آئی شہیدوں کی لہو جلنے لگا
ضبط جب ٹوٹا تو آنسو تھے روانی سے الگ

محمد نوید مرزا/لاہور

ٹھکانہ اس میں اندھیروں کا ہو نہیں سکتا
مرے حسینؑ کا جس دل میں غم چمکتا ہے
رہِ حسینؑ پہ چلتے رہو سدا اختر
یہ راہ وہ ہے جہاں پر قدم چمکتا ہے
جہان میں جو حسینی علم چمکتا ہے
یہ کربلا کے شہیدوں کا غم چمکتا ہے
میں جب حسینؑ کہتا ہوں
مرے شعور میں باغِ ارم چمکتا ہے

سلیم اختر ملک/لاہور

سلام

دل نے کہا امام پہ ایسا سلام لکھ
کامل ہیں ذات پاک وہ ماہِ تمام لکھ
جنت کی ہے تلاش تو خود کو بصد خلوص
اُن کے کسی غلام کا ادنیٰ غلام لکھ
لرزے تھے اُس کے ہاتھ بھی جس سے کہا گیا
کربل کے کشتگان میں اصغر کا نام لکھ

حمد، نعت، سلام

کرنی پڑے جو مختصر یہ داستانِ کرب
بجھتے دیے کے ساتھ ہی جلتے خیام لکھ
گریہ کے واسطے بھی الفاظ کم نہیں
بنتِ علیؑ و فاطمہؑ کوفہ و شام لکھ

ڈاکٹر فخر عباس/لاہور

سلام

لا الہ پر جان دے دی اے میرے رہبر سلام
ہے تیرا ممنون عالم اس کہانی پر سلام
دیکھ کر بچوں کو پیاسا آسماں رونے لگا
وقت بھی شرما گیا ہے اے علی اصغرؑ سلام
آپ کی خاطر رہے خاموش بس میدان میں
سو گئے بازو کٹا کے ثانیِ حیدرؑ سلام
اشقیا نے جو کیے تجھ پر ستم مولا حسینؑ
دو جہاں لرزا گئے اے راحتِ سرورؑ سلام
کھائی جب سینے پہ برچھی جاں لبوں پر آ گئی
تیری ہمت تیرے جذبے کو علی اکبرؑ سلام
جگمگائے گی یہ شمع آج سے اسلام کی
خوں ترے سے جو جلی ابن علی صفدرؑ سلام
آپ کا اطہر گلا مرسلؐ نے چوما رات دن
دے گیا ہے کربلا میں کند وہ خنجر سلام
ایک اک ہو کر بھی تم پر فدا ہونے لگے
ہے بڑا مقبول تیرا مختصر لشکر سلام

مقبول ذکی مقبولؔ/منکیرہ

سلام

یا حسینؑ ابن علیؑ اے بے وطن تجھ کو سلام
اے نواسۂ نبیؐ اے بے وطن تجھ کو سلام
کربلا کی ریت میں شامل ہوا تیرا لہو
کہہ اٹھی ذات جلی اے بے وطن تجھ کو سلام
جان دینے کے لیے گھر چھوڑ کر تو چل پڑا
اے محمدؐ کے وصی اے بے وطن تجھ کو سلام
ہر بشر کو مل رہی ہے روشنی وہ رات کی
جو ترے خوں سے ملی اے بے وطن تجھ کو سلام
دیکھ کر سجدہ ترا سب انبیاء کہنے لگے
سب خدائی کہہ اٹھی اے بے وطن تجھ کو سلام
ذرہ ذرہ اس جہاں کا رو کے یہ کہنے لگا
اے امامِ متقی اے بے وطن تجھ کو سلام
خشک مٹی تر ہوئی شبیرؑ تیرے خون سے
خاک بھی کہنے لگی اے بے وطن تجھ کو سلام
زیرِ خنجر کربلا میں رکھ کر سجدہ تیرا
موت بھی کہتی رہی اے بے وطن تجھ کو سلام
سر رکھا مقبولؔ سجدے میں اٹھایا پھر نہیں
لاج مرسلؐ کی رکھی اے بے وطن تجھ کو سلام

مقبول ذکی مقبولؔ/منکیرہ (بھکر)

سلام بحضور امام حسینؑ

رہتا ہے سارا سال مجھے غم حسینؑ کا
ٹھہرا ہوا ہے مجھ میں تو موسم حسینؑ کا
اُس کو جھکا نہیں سکا کوئی یزید وقت
اُونچا گلی گلی میں ہے پرچم حسینؑ کا
آؤ کہ اور تیز کریں نوحے کی صدا
حق تو ادا ہوا ہے بہت کم حسینؑ کا
جاں دے کے اُس نے دینِ محمدؐ بچا لیا
احساں اُتار سکتے نہیں ہم حسینؑ کا
ہو دل سے جیسے آنکھ تلک کربلا بچھی
ہر اشک کرتا جاتا ہے ماتم حسینؑ کا
اس کے لہو نے کر دیا تنہا یزید کو
بھرتے ہیں آج تازؔ بھی دم حسینؑ کا

تازؔ اوکاڑوی/لاہور

سلام

اپنی مثال آپ قیادت حسینؓ کی
ہر دل میں موجزن ہے محبت حسینؓ کی
سینہ سپر رہو سدا باطل کے سامنے
پیغام مومنوں کو شہادت حسینؓ کی
دینِ نبیؐ کی آبرو زہراؓ کا ہر گلاب
خونِ علیؓ کی شان شجاعت حسینؓ کی
سب کچھ لٹا دو پرچم توحید کے لیے
اُمت کے واسطے ہے وصیت حسینؓ کی
کیسے کرے حسینؓ کی کوئی برابری
کعبہ حسینؓ کا ہے شریعت حسینؓ کی
زندہ ہیں ہم حسینؓ کے مرنے کے بعد بھی
یارب عطا ہو ہم کو رفاقت حسینؓ کی
شاہدؔ ہمیں یقین سے بڑھ کر یقین ہے
جنت میں لے کے جائے گی نسبت حسینؓ کی

ہمایوں پرویز شاہدؔ/لاہور

شاعری میرا پیشہ ہے

پابلو نرودا/ترجمہ: کشور ناہید

میں اور یجنٹی پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا ساختہ پن تھا جو خود بخود ختم ہو رہا تھا۔ مجھے تو ایسی شخصیت پر یقین تھا کہ جس کی زبان، کسی اسلوب یا کسی فنکارانہ رویے سے مرتب ہوئی ہو اور یجنٹی جدید دور کی پروردہ اور سائنسی فراڈ کا درجہ رکھتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو ملک الشعرا منتخب کرانے کو بے تاب نظر آتے ہیں اور کچھ عالمی سطح پر مشہور ہو جانے کا جنون رکھتے ہیں، تو وہ اپنے اپنے کارندوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ ان اصحاب سے نفرت کرتے ہیں کہ جو ان سے مقابلہ کرنے کا سوچتے بھی ہیں اور شاعری اس وقت ان کے لیے ایک ڈھکوسلہ لگتی ہے۔

بہر حال یہ بھی فرد کے اندر کے خلجان کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسی کے باعث فطرت، تہذیب اور معاشرتی زندگی کے اضافی بوجھ ہی، شاعر کو اپنے اندر کا بہترین سرمایہ باہر نکالنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ماضی میں بہت شریف اور بردبار شاعر، مثلاً کوئے ویڈو نے ان عنوانات کے تحت نظمیں لکھیں کہ ''ہووک کی نقل میں''، ''اوور کی نقل میں'' یا ''لوکریٹس کی نقل میں''۔

میں اپنے واسطے، اپنے ہی اسلوب کو حاوی رکھوں گا کہ جس میں قوت، وقت کے بہاؤ کے ساتھ زندگی کی دوسری اشیاء کی طرح آئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری ابتدائی کتابوں میں جذباتیت زیادہ ہے اور شاعر کے لیے یہ بہت ضرر رساں ہوتا ہے جب وہ دل کے نازک لمحات کی آواز کو فراموش کرتے ہوئے گزر جانا چاہتا ہے۔ البتہ تجربے کے چالیس برسوں کے بعد، میرے خیال میں شاعر، اپنے جذبات پر کلی طور پر حاوی آ سکتا ہے اور تحریر میں ان کو ضبط میں رکھ سکتا ہے۔ میں رہنمائی حاصل کرنے والی بے ساختگی میں یقین رکھتا ہوں۔ اس کے لیے شاعر کے توشے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ محفوظ ہونا چاہیے کہ بوقت ضرورت کام آئے۔ یعنی پہلے تو ذہنی کاوش کا کچھ ذخیرہ، شعری اسالیب کا کچھ سرمایہ، لفظوں، آوازوں، تصورات اور شہد کی مکھیوں کی طرح آوازوں کا گنجینہ۔ ان سب کو جلد سے گرفت میں لا کر جیبوں میں بھر لینا چاہیے۔ میں اس سلسلے میں خاصا ست واقع ہوں مگر مجھے معلوم ہے کہ میں کوئی اچھی نصیحت آگے بڑھا رہا ہوں۔ مایاکوفسکی کے پاس ایک چھوٹی سی نوٹ بک تھی۔ وہ اس پر مستقل لکھتا رہتا تھا۔ ویسے تو دل میں جذبات کا دفینہ ہمیشہ محفوظ رہتا ہے مگر اس کو مستقل اور لافانی حیثیت کیسے دی جا سکتی ہے ایسے کہ جب وہ آشکار ہوں تو آپ ان کے وجود سے آگاہ ہوں۔ پھر جب ہم کاغذ پر لکھنے بیٹھیں تو پھر یہ آگاہی جذباتیت کے وفور سے سوا بہت وضاحت کے ساتھ ہماری گرفت میں آئے گی۔

میری شاعری کے بیشتر حصے میں، میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کسی بھی موضوع کو موضوع سخن بنا سکتا ہے۔ بشرطیکہ موضوع، معاشرے یا محدود طبقے کے لیے خصوصی توجہ کی منزل پاتا ہو۔ قدما کے سارے عظیم فن پارے، درخواست نما، تحریر کردہ ہی ہیں۔ ''جارجکس'' رومن دیہی علاقوں کے کسانوں کو کاشتکاری کی ترغیب دلانے والا پروپیگنڈا ادب ہے۔ ایک شاعر کسی یونیورسٹی یا مزدور یونین کے لیے لکھ سکتا ہے۔ اس طرح پیشہ ور کارکنوں اور فنی مزدوروں کے لیے بھی نظم بنا سکتا ہے۔ آزادی تحریر، ایسی تحریروں یا ایسی تحریکوں سے نابود نہیں ہوئی۔ معجزاتی تصور کے قصے اور شاعر کے خدا سے ہم کلام ہونے کے مافوق الفطرت بیانات، ذاتی اغراض کی بنا پر بنائے گئے معروضات ہیں۔ تخلیق کے بڑے سے بڑے لمحے میں وہ تخلیق، عضویاتی طور پر کسی تحریر، تخلیق یا تجربے سے مستعار ہو سکتی ہے۔

اب میں ان فرضیاتی یادداشتوں کے حصار سے نکل کر سینٹیا گو میں گزری ہوئی ادبی زندگی کو یاد کرتا ہوں کہ جب میں ایک نوجوان تھا۔ مصور اور ادیب، عوام کے پیار کی چھاؤں میں تخلیقی خوشبو لیے، اپنے اپنے فن کی جانب ملتفت رہتے تھے۔ عجب غزلیہ خزاں آلود منظر، شاعری اور مصوری، دونوں پر حاوی رہتا۔ ہر فنکار ایک دوسرے سے زیادہ انا پرست، بے ترتیب اور اخلاقی بحران کا

شکار نظر آنے کی کوشش کرتا۔ اس سے چلی کے سماجی حلقوں میں بڑا گہرا اضطراب بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔ اس ری نے، باغیانہ تقریریں کیں۔ فلزریٹ پمپا پہ وہ کارکن جمع تھے کہ جو برِاعظم میں سب سے اہم عوامی تحریک منظم کرنے میں سرگرم تھے۔ وہ جدوجہد کے سب سے خوبصورت دن تھے۔ کارلوس ویکونا، گان ڈلفوار اور میں نے طلبا کی انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا۔ میری پسندیدہ کتاب آندریکی ''سچایو گولیو'' تھی۔ دوسرے ساتھی آرٹس کے عریاں ناول پڑھ کر خود کو نظریاتی طور پر مستحکم محسوس کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ آج کل وجودی عریانیت کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ دانشور، شراب خانوں میں خود کو آسودہ کرتے تھے۔ چمکتی سنہری شراب کی روشنی میں صبح دم تک غربت بھی سنہری اور چمکدار معلوم ہوتی تھی۔ ''جوان اُگاتا'' بہت ہی خداداد شاعر تھا مگر شراب کے باعث، جسم سے آزاد ہو کر، قبر کی منزل کی جانب رواں تھا۔ بلکہ ایک قصہ بھی عام تھا کہ اس کو ورثے میں بہت کچھ ملا تھا اور وہ اپنی ساری دولت، اپنے کھنڈر مکان کی میز پر بلوں کی شکلوں میں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے شرابی ساتھی جو دن بھر سوتے تھے، وہ رات ہوتے ہی شراب تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ مگر ''جوان اگاتا'' کی شاعری بالکل چاندی کی لہر کی طرح ہے کہ جس نے ہماری شاعری کے جنگل میں سکون کی آمیزش تو کی ہے، مگر بے سکونی کبھی پیدا نہیں کی۔ یہی خطاب تھا کہ جو جدید انتخاب مرتب کرنے والے مولینا تو ییز اور اوسگو ارکاسترو نے ''جوان اگاتا'' کو دیا تھا۔ یہ بہت ہی مکمل انتخاب تھا کہ جس میں بڑے ادب کے مضمرات کو سامنے رکھ کر تخلیقات جمع کی گئی تھیں اور بڑے وقفے کے بعد جامع اور خوبصورت انتخاب سامنے آیا تھا۔

میرے اُوپر جس شخصیت نے سب سے زیادہ اثر کیا وہ الیروآیا ززون ہے کہ جو نئے ادب کا آمر قرار دیا جاتا ہے۔ ہر چند اب کوئی اُسے یاد نہیں کرتا۔ وہ بودلیئر سے متاثر ہونے والوں میں تھا، بہت ہی قابل ذکر چلی کے، بارباجیکب، بہت آتش فشاں، خوبصورت مگر پاگل شاعر تھا۔ وہ اپنی پوری آواز کے ساتھ مجنونانہ طریقے پر بولتا تھا۔ اس نے اخلاقی مسائل بیان کرنے کے لیے ایک بڑا ہی دل گداز طریقہ مرتب کیا تھا کہ جو ہمارے ادبی حلقوں میں مقبولِ عام بھی ہے۔ اس کی آواز گلوگیر تھی اور اس کا ماتھا زردی مائل رنگ لیے گنبد ذہانت پر سربلند تھا۔ اس کے فقرے کچھ اس طرح کے ہوتے تھے ''دائروں کی دائرہ گری'' ''ابہام کی ابہامیت'' وغیرہ وغیرہ۔ اس کے اندر ماورائی اور زمینی اندازِ تخاطب کا عرق شامل تھا۔ وہ ایسا ذہین شخص تھا کہ جس نے اپنی اصلی جنت، اپنے نظریات کے اوپر وار دی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی اکلوتی نظم صرف شرط جیتنے کے لیے لکھی تھی اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر چلی کی شاعری کے کسی بھی انتخاب میں وہ نظم کیوں نہیں آتی ہے۔

....

میں نے پہلے کہا ہے کہ میں اپنے آبائی قصبے ٹیموکو میں، جبریلا مسترال سے ملا مگر بعد میں انھوں نے اس شہر سے قطعی علیحدگی اختیار کر لی۔ جبریلا اسی زمانے میں اپنی مشکلات اور زندگی کے تفکرات کے نصف النہار پر تھیں۔ وہ مجھے کبھی راہبہ کی طرح اور کبھی مدرسپیریئر کی طرح ہر وقت کام میں مصروف دکھائی دیں۔

انہوں نے اسی زمانے میں اپنی مشہور نظم ''ماں اور بچہ'' لکھی۔ نظم، خوبصورت، مرصع اور خوش لفظ، تحریر ہے کہ ان کے خیال میں نثر ہی شاعری کو وقیع تر بنانے کا آلہ ہے۔ جبرئیل نے اپنی نظموں میں پیدائش، حمل اور بچے کی پرورش کے مدارج تفصیل کے ساتھ دیے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر لوگوں نے خاص ٹیموکو کے لوگوں نے بدتمیزی کے قصے گھڑے اور فضول باتیں بنائیں کہ جنھیں سن کر وہ بہت آزردہ ہوئیں اور کچھ افواہیں تو ان ثقہ لوگوں نے پھیلائیں کہ جنھیں خود بڑا وسیع الظرف اور حوصلہ مند سمجھتا تھا۔ جبرئیل کو ان پر بہت غصہ آیا اور یہ غصہ اور ملال، اس پر موت تک حاوی رہا۔

کئی سالوں بعد اپنی عظیم کتاب کے اولین ایڈیشن میں انھوں نے ایک طویل مگر بیکار تحریر دی تھی کہ جس میں دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک جو غلط بیانیاں اور تہمت تراشیاں کی گئیں، اس کا تذکرہ اور اس پر غم و غصے کا اظہار تھا۔

جب وہ اپنا یادگار نوبل پرائز لینے کو جا رہی تھیں تو ٹیموکو کے راستے سے گزرتا تھا۔ ہر روز سکول کے بچے ریلوے اسٹیشن کے پھاٹک پر کھڑے، ان کا انتظار کرتے۔ سکولوں کی لڑکیاں

طوفان باد و باراں کی فکر نہ کرتے ہوئے منتظر کھڑی رہیں۔ مگر یہ ایک بیکار انتظار تھا کہ جبریٔل نے رات کا وقت سفر کے لیے منتخب کیا اور ٹیموکو سے خاموشی سے گزر گئیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بری تھیں یا کمزور تھیں، نہیں بلکہ یہ کہ ابھی تک ان کے دل کے زخم ہرے تھے اور اتنے گہرے تھے کہ آسانی سے بھر نہیں سکتے تھے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ محبت اور نفرت نے اس شاعر کی زندگی میں اتنا اثر کیا اور ایسی شاعری لکھوائی کہ جو کسی انسان کی روح کی آئینہ دار ہوسکتی ہے۔

میرے لیے تو وہ ہمیشہ فراخ دلانہ مسکراہٹ لیے منتظر ملاقات رہتی تھیں۔ ایسی مسکراہٹ کہ جیسے گہرے گندمی رنگ کی ڈبل روٹی پر سفید میدہ چھڑک دیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کے فن کے تنور میں کون سے اجزا تپ رہے تھے، اس کی شاعری کے لوازم کیا تھے کہ تمام تر درد اور حزن، شاعری کا منبع تھا۔

میں نہ اس کی چھان پھٹک کروں گا اور نہ جاننا ہی چاہوں گا اور اگر مجھے معلوم بھی ہو گئے تو وہ بتانا بھی نہیں چاہوں گا۔

جنگلی سرسوں کے پھول ستمبر کے مہینے میں کھلتے ہیں۔ اس وقت پورا دیہی علاقہ زرد قالین کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ادھر جنوبی ساحل پر گزشتہ چار دن سے ہوا بھی وحشیانہ طریقے پر چل رہی ہے۔ رات بھی ایسی ہی ہنگامہ خیز آوازوں سے بھرپور ہے۔ سمندر وسیع سنہریت کے افق پر سفیدی کی اوڑھنی لیے موجزن ہے۔

تم اے جبریٔلا! مسترال جنگلی شگوفوں، پہاڑوں اور طوفانی ہواؤں کی لاڈلی بیٹی۔ ادھر آؤ ہم بصد خوشی تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ کوئی تمہارے گیت نہ فراموش کرے گا کہ تم چلی کی ہو اور چلی کے ساحلوں کی ہواؤں کا سندیسہ سمجھتی ہو۔ تم لوگوں سے رشتہ رکھتی ہو۔ کوئی بھی چلی کا فرد، بچوں کے ننگے پیر والی کا تمہارا گیت نہیں بھولے گا۔ کوئی بھی تمہارے غم و غصہ سے بھرپور فقرے نہیں بھولے گا۔ تم امن کی حرکت خیز دوست ہو۔ ان تمام گفتہ و ناگفتہ اسباب کی بنا پر ہم تمہیں پیار کرتے ہیں۔

تم اے جبریٔلا! جنگلی سرسوں، چٹانوں اور بلند ہواؤں کی لاڈلی بیٹی! آؤ۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ میں تمہیں کانٹوں اور شگوفوں دونوں کی ملائمت اور محبت کا نذرانہ اس لیے پیش کروں کہ تمہاری عظمت اور ہماری ناقابل شکست دوستی، اس کی متقاضی ہے۔ ستمبر کا دروازہ کہ جو پہاڑیوں سے بنا ہے بہار کا زمانہ، تمہارے لیے سب دروازے وا ہیں۔ میرا دل جتنا تمہیں مسکراتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اتنا کسی اور چیز سے خوش نہیں ہوتا۔ آؤ! اپنے وطن کی مقدس سرزمین پر آؤ کہ یہ زمین پھولوں کے مسکرانے کے لیے تخلیق کی گئی۔ آؤ اس کے لوگوں کے ساتھ مل کر محبت کے گیت گاؤ۔

مجھے خوشی ہے کہ وہ لفظ اور جذبات کہ جن کی ساری دنیا قدر کرے گی میں ان جذبات میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا کرے کہ تمہاری روح اور دل سکون محسوس کرے، زندہ رہے، جدوجہد کرے، نغمگی محسوس کرے اور ثمر دیکھے، اپنے ملک کی تنہائیوں کے ساحلوں پر میں تمہاری لائق تکریم پیشانی کو چومتا ہوں اور تمہاری دائمی شاعری کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

سلام

حضرت علیؑ کی آنکھ کے تارے تجھے سلام
آقائے دو جہاں کے دُلارے تجھے سلام

ہیں دین میں حسینؑ بھی نانا کے ساتھ ساتھ
آلِ نبیؐ اے دین ہمارے تجھے سلام

میں کربلا کی شام یہ جب سوچنے لگوں
آتے ہیں میری سوچ میں تارے تجھے سلام

پانی فرات سے نہ میسر ہوا تجھے
اے بحرِ دو جہاںؐ کے کنارے تجھے سلام

وہ کوفیوں کا کھیل، وہ پہرے، وہ شامِ غم
تجھ کو ہرا سکے نہ یہ سارے تجھے سلام

جس دم شہید ہو کے گرے خاک پر حسینؑ
بولی زمین کربلا پیارے تجھے سلام

ہوتا ہے میرا غم بھی قمران کے ساتھ ساتھ
کہتے ہیں جو بھی سوگ کے مارے تجھے سلام

قمر ریاض/مسقط

یہ ایک سڑک کی داستان ہے۔ سڑک شیر شاہ سوری نے تعمیر کرائی تھی مگر داستان کسی اور نے تحریر کی ہے۔ 'تعمیر' اور 'تحریر' کے مابین ساڑھے چار سال کا عرصہ حائل ہے۔ سڑک پندرہ سو میل طویل ہے۔ کم وبیش شیطان کی آنت کے برابر۔ سڑک کی روداد کسی 'سڑک چھاپ' نے رقم نہیں کی بلکہ اردو کے ممتاز نثرنگار اور صداکار رضا علی عابدی نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب اپنی اوّلین صورت میں ایک ریڈیائی دستاویزی پروگرام ہے جو بی بی سی کی اردو سروس کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ آواز کی لہروں پر جو لفظ سفر کرتے ہیں، عام طور پر وہ رزق ہوا ہو جاتے ہیں لیکن حرف نوشتہ کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ یہ کتاب 'تقریر' سے 'تحریر' کا سفر بھی ہے۔ اس سفر کی کہانی 'محرر' ہی سے سنتے ہیں:

''میں نے ۸۲ء میں ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کر کے یہ دیکھا تھا کہ ہماری قدیم کتابیں، مخطوطے اور دستاویزیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس دورے کی بنیاد پر بی بی سی کی اُردو سروس نے پروگرام 'کتب خانہ' نشر کیا جس کی مقبولیت اور سامعین کے اصرار کو دیکھتے ہوئے 'کتب خانہ' کو کتاب کی شکل بھی دی گئی۔ پھر میرے دوسرے دورے کا وقت آیا۔ یہ بات ۸۵ء کی ہے۔ اس وقت پہلا سوال یہ اٹھا کہ اس دورے کا عنوان کیا ہو۔ اب کس موضوع پر پروگرام ترتیب دیا جائے۔ بہت سے ساتھیوں نے بہت سے عنوان سوچے کہ ایک روز اردو سروس کے اُس وقت کے سربراہ ڈیوڈ پیج یہ تجویز لے کر آئے کہ کیوں نہ پشاور کو کلکتے سے ملانے والی گرینڈ ٹرنک روڈ کو اپنا موضوع بنایا جائے۔ یہ ایسی جی کو لگنے والی تجویز تھی کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ خود میرا تو یہ حال ہوا کہ اسی رات شیر شاہ کی تاریخ پڑھ ڈالی اور اگلے چند دنوں میں سارا بنیادی مطالعہ کر لیا اور جس وقت روانگی کی گھڑی آئی، میرا سارا ہوم ورک مکمل تھا۔ جی ٹی روڈ پر میں نے یہ سفر ۸۵ء کے موسم سرما میں کیا تھا۔ اس کتاب میں سارے مشاہدے اُسی برس کے اُسی موسم کے ہیں۔''

رضا علی عابدی ''چل میرے خامے'' کا ورد کرتے ہوئے سڑک پر رواں دواں ہو گئے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ وہ سیر گل کے لیے روانہ نہیں ہو رہے۔ بلکہ ان کے سپرد کچھ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں بھی ہیں جنھیں انہوں نے معین وقت میں انجام دینا ہے۔ اس قید اوقات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری تھا کہ جرنیلی سڑک سے یوں گزرا جائے جس طرح میر صاحب 'جہان' سے گزرے تھے۔ عابدی صاحب بہت سے مقامات سے سرسری ہی گزرے ہیں لیکن بعض 'جہان دیگر' ایسے تھے جہاں انہوں نے قیام بھی کیا ہے۔ ان کا طریقہ سفر یہ رہا کہ وہ تیز قدمی کے ساتھ سڑک پر رواں دواں رہتے ہیں۔ راستے میں اگر کوئی شہر آتا ہے تو حیرت اور حسرت کی نگاہ در و دیوار پر ڈالتے ہیں، کسی شہری سے ملاقات ہو جائے تو اس کا حال احوال معلوم کرتے ہیں، کیفیت شہر کی دریافت کرتے ہیں اور ان تمام باتوں کو اپنی یادداشتوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ یوں ان کے سفرنامے میں ایک ایسا عوامی اور معاشرتی رنگ پیدا ہوتا ہے جس کی شوخی اور دیدہ زیبی سے انکار ممکن نہیں۔ یہ سفرنامہ اس وقت 'خواص پسند' بن جاتا ہے۔ جب وہ کسی شہر کے مرکز میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے بارے میں اہم سماجی اور معاشرتی معلومات فراہم کرتے ہیں اور وہاں کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ کو زیر بحث لاتے ہیں۔ شہر کی کہنہ عمارات اور بزرگانِ قدیم ان کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ پیرانِ شہر سے انھیں اہم اور نادر معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں لیکن ایک المیہ بھی سامنے آتا ہے کہ یہ بزرگ ''قصہ قدیم و جدید'' پر خاصا یقین رکھتے ہیں۔ یہ ماضی پسندی، تاریخ کے عمل اور ارتقا کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی۔ گوجراں والہ کے ایک بزرگ شہری میر عطا محمد صاحب یادِ ماضی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اُس وقت یہ رواج تھا کہ اب تو مجھے شرم آتی ہے کہ جس وقت انسان کی شادی ہوتی تھی تو اُس کی بیوی اُس سے بھی پردہ کرتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے اس کا شوہر اندر آ گیا ہے تو اس کی بیوی خدا کی قسم شوہر سے بھی پردہ کرتی تھی۔ کوئی بچہ ہو گیا ہے تو اُسے تو اُٹھانا ہی نہیں۔ وہ تو دادا دادی جانیں۔ اب تو شادی بعد میں ہوتی ہے۔ بازو میں بازو پہلے ڈالے ہوتے ہیں، ہمارے وقت یہ بات تھی کہ کوئی خراب کام نہیں ہوتا تھا۔ ہم اکٹھے لڑکے اور لڑکیاں کھیلا کرتے تھے اور اُس وقت بجلی نہیں ہوتی تھی۔ کسی گھر میں سو رہے ہیں سب لڑکے اور لڑکیاں۔ کسی گھر میں سو رہے، تمام محلے والے اطمینان سے سو گئے ہیں کہ بھائی وہ کھیلتے کھاتے کسی جگہ سو گئے ہوں گے۔ بہت اچھا زمانہ تھا وہ۔''

دلی کے لالہ امرناتھ نے ماضی و استقبال کا موازنہ یوں کیا ہے:

''سکون وس زمانے میں تھا۔ سکون کی زندگانی جو تھی وس زمانے میں تھی، کیوں، کھانے پینے کی بہت

موج تھی۔ پہلے جیسا گھی نہیں، دودھ نہیں، وہ نہیں۔ پہلے زمانے میں ہمارے چار پیسے سیر دودھ، سمجھے؟ اور ڈیڑھ سیر کا ہم نے گھی کھایا ہے بچپن میں، ڈیڑھ سیر کا۔ سمجھے؟ اب وہ گھی نہیں۔ سمجھے؟ کوئی عزت نہیں انسان کی۔ اب تو پیسے کی عزت ہے۔ انسان کی عزت نہیں ہے، اور وس زمانے میں انسان کی عزت تھی، پیسے کی عزت نہیں تھی، سمجھے؟ پہلے بڑے بوڑھے کی عزت کیا کرتے تھے۔ اُٹھایا کرتے تھے، بٹھایا کرتے تھے اور اب پیسے والے کی عزت ہے، بڑے کی عزت نہیں ہے حضور۔''

یہ بزرگ لمحہ موجود سے گریزاں سہی مگر ان کی باتیں اور یادیں اتنی بے قیمت اور بے وقعت نہیں کہ انہیں 'قابل سماعت' ہی نہ سمجھا جائے۔ عابدی صاحب کا بھی یہی خیال ہے:

''......ان کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے بدلتے ہوئے وقت کو اپنی بجھی بجھی سی ضعیف آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک جرنیلی سڑک ہی کیا، ہر سڑک کے کنارے آباد اگلے وقتوں کے یہ لوگ یہی گلہ کرتے ملیں گے کہ وہ زمانہ جو گزر گیا وہ کتنا اچھا زمانہ تھا اور وقت جو آ رہا ہے، قیامت سے کم نہ ہوگا۔ یہ لوگ بوڑھے سہی، وقت کے دھارے سے بچھڑے ہوئے سہی، مگر ان کی بات ایسی ہے کہ ذرا دیر ٹھہر کر سن لی جائے تو ذہن میں سوئے ہوئے کچھ تار جھنجھنائیں گے ضرور۔''

عابدی صاحب کو اس سفر کے دوران بہت سے مسافر نواز میسر آئے۔ ان میں ہر طبقے اور ہر پیشے کے افراد شامل ہیں۔ ان میں تاریخ دان بھی ہیں اور سیاست دان بھی۔ پروفیسر اور پرنسپل بھی ہیں اور کالج کے طلبہ بھی۔ شاعر، دانش ور، صحافی اور مدیر بھی ہیں۔ صنعت کار اور اہل حرفت بھی ہیں، درگاہ کے سجادہ نشین اور مسجد کے پیش امام بھی ہیں۔ وکیل، ڈاکٹر، سماجی کارکن، زمین دار، بندۂ مزدور، گاڑیوں پہ پینٹ کرنے والے، برتن ساز، ڈرائیور، پنکھے بنانے والے، رنگین ساڑیوں پہ پھول کاڑھنے والے۔ غرض یہ کہ ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں۔ عابدی صاحب نے ان لوگوں سے شعوری طور پر ملاقات کا اہتمام کیا ہے۔ وہ ان سے مکالمہ کرتے ہیں، ان کے حافظے کا امتحان لیتے ہیں اور بعد ازاں ان مکالمات کو ضبط تحریر میں لے آتے ہیں۔ یہی زندگی آموز مکالمات اور پرمغز معلومات ہی دراصل حاصل سفر ہیں اور روح سفر بھی!

کسی شہر کے قدیم باشندے اور بزرگ شہری، عابدی صاحب کا خصوصی ہدف رہے ہیں۔ ایسے افراد سے انھیں شہر کے بارے میں وہ معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کتابوں میں درج نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات ان کی ملاقات کسی زندہ دل بزرگ سے بھی ہو جاتی ہے جو اپنی شگفتہ باتوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں:

''آگرے کی ایک اور شخصیت جسے بھولنا مشکل ہے حکیم سید مبین الزماں قادری صاحب تھے جنہیں دنیا مولانا مبین کے نام سے جانتی تھی۔ چھوٹا سا قد، سرخ وسپید رنگت، مہندی سے رنگے ہوئے جھلملاتے بادل اور ڈاڑھی، سفید براق لباس، چاندی کے کام کے سلیم شاہی جوتے، پھرتیلا بدن اور کھلاڑیوں جیسا جسم۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں اس محفل کی جان بن جائیں اور اسے گل وگلزار بنا دیں۔ میں اصرار کر کے حکیم صاحب کی جوانی کے قصے سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''آپ تو جوانی میں کھلاڑی رہے ہیں، آپ کیا کھیلتے تھے؟'' جواب ملا ''میں ایک تو کرکٹ کھیلتا تھا، ایک فٹ بال میں گول کیپر کھیلتا تھا۔ میں کرکٹ میں فاسٹ بولر تھا۔ اس وقت کے اخباروں پانیئر اور لیڈر وغیرہ سب میں میرا ریکارڈ ہے اور یہاں تک ریکارڈ ہے کہ پانچ رن دے کر پانچ کھلاڑی آؤٹ کیے۔ میں اُنیس قدم بھاگ کر گیند پھینکتا تھا اور کئی آدمی میرے لنگڑے کیے ہوئے موجود ہیں۔ دو کی ناکیں میں نے توڑ دی ہیں۔ ایک صاحب کا گھٹنا ٹوٹ گیا، آج تک وہ بیساکھیاں لے کر چلتے ہیں۔ یہاں مثالیں موجود ہیں۔ یہاں ایک استاد مجید تھے، ان کی ناک کے دو ٹکڑے کر دیے۔ انور بھی ابھی موجود ہے۔ اس کی ناک توڑ ڈالی۔''

ایک دلچسپ واقعہ سہسرام کے بزرگ فصیح الدین صاحب نے بھی سنایا:

''ہوتا یہ تھا کہ امرا کے ہاں بھانڈ بلائے جاتے تھے۔ دو دو دن ناچ ہوتی رہتی تھی اور کافی انعام واکرام ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک صاحب حاضر مجلس تھے، انہوں نے خوش ہو کر بھانڈوں کو اپنا دوشالا دے دیا انعام میں۔ تھا پرانا وہ۔ تو اب بھانڈوں نے اپنا نقل کرنا شروع کر دیا۔ کہا کہ اس میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسرے کو بلایا، تیسرے کو بلایا۔ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ چوتھا آیا۔ اس نے کہا اچھا چشمہ لاؤ ہم پڑھ دیتے ہیں۔ لائے چشمہ، پڑھا گیا، سو اس میں لکھا تھا لا الہ الا اللہ۔ کہا کہ کچھ اور لکھا ہوگا۔ دوسرے نے تیسرے نے، پھر چوتھے نے پڑھا۔ کہا کہ نہیں اس کے بعد کچھ اور نہیں لکھا ہے۔ کہا کہ 'محمد رسول اللہ' نہیں لکھا ہے؟ کہا کہ نہیں یہ کیسے لکھا رہے گا۔ یہ تو ان کے وقت سے پہلے کا ہے۔ یہ عالم تھا بھانڈوں کی حاضر جوابی کا۔''

افراد کی طرح عمارات اور مقامات کی بھی طویل فہرست ہے جنھیں عابدی صاحب نے چشم تحیر سے دیکھا ہے۔ یہ فہرست جرنیلی سڑک سے کم طویل نہیں۔

حلیم قریشی کی شاعری

فرحت زاہد/ لاہور

جناب حلیم قریشی کا پہلا مجموعہ کلام "تاخیر" غالباً ۹۰ کی دہائی میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کی۔ اب ان کا دوسرا مجموعہ "جاں ستاں" ہمارے سامنے ہے، جو کہ خاصی تاخیر سے یعنی تقریباً ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد شائع ہوا ہے۔ ان کے دونوں مجموعہ ہائے کلام کو پڑھنے کے بعد میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ شاعری اور ادب ان کا مسئلہ ہے اور یہ صرف شہرت کی طلب اور کسی جزوقتی بہاؤ کے تعاقب میں شعر نہیں کہہ رہے۔

زیرِ نظر مجموعہ کا نام "جاں ستاں" ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس شعری مجموعہ کا اس سے بہتر نام رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ "جاں ستاں" فارسی حرفِ صفت ہے۔ یعنی جاں لینے والا "معشوق" ان کی ساری شاعری جاں ستانی کی داستاں ہی تو ہے، اور بآوازِ بلند کہہ رہی ہے، دیکھو یہ میرے داغ ہیں۔

میں ہمیشہ بک لاؤنچنگ (Book Launcing) تقریب کو "تقریبِ پذیرائی" ہی کہتی ہوں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ صاحبِ کتاب جس جاں کنی و جاں فشانی سے شعر تخلیق کرتا ہے، یہ پذیرائی اُس کا حق بن جاتی ہے۔ ایک تو اچھے شعر پر "واہ" کرنا دوسرا ادبی برادری کا ایک فرد ہونے کے ناطے ایک اچھے شاعر کا استقبال کرنا، گویا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔

حلیم قریشی ایک سینئر اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ یہ شعر کیوں کہتے ہیں، انھی کی زبانی سنئے "اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری ہماری زندگیوں کو زرخیز بناتی ہے اور ہمارے لیے ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرتی ہے لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یہ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ارتقا کے عمل کو متحرک رکھنے کے لیے ہماری معاون ثابت ہوتی ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنے دور کے مضمرات تک رسائی کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔"

یہ جاننے کے بعد کہ حلیم قریشی شعر اپنی باطنی ضرورت کے لیے کہتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ ان کا نظریۂ فن ان کے اپنے الفاظ میں کیا ہے "میں سمجھتا ہوں کہ بڑی شاعری کسی بھی نظریے کے مکمل تابع نہیں ہو سکتی۔ اسے ایک غیر معمولی وسعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک کھلی فضا میں ہی اپنے حسن اور خوشبو کو قائم رکھ سکتی ہے۔ اگر ہم چھیاسٹھ سالہ ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ادب میں ایک نیا تخلیقی ذہن پیدا ہوا اور شاعری میں نئے اسالیب و افکار نے جگہ بنائی۔ یہ ذہن حتمی طور پر کسی سطح پر بھی مشروط نہیں لیکن اپنے معاشرے کی تمام ضروریات سے آگاہ ہے اور اپنے ذہن کی رعنائیوں اور رنگوں کا دلدادہ ہے۔ یہ ذہن چاہتا ہے کہ مستقبل کے نئے امکانات کو اپناتے وقت اپنے تہذیبی اور ثقافتی رنگوں کو ماند نہ پڑنے دیں۔ اس لیے کہ اس کی پہچان اور مستقبل کی آبرو اسی میں ہے۔"

زیرِ نظر مجموعہ کی پہلی غزل کی آب و تاب دیکھئے:

عشق نے بھید وہ کھولا کہ تماشا ہوئے ہم
کبھی رادھا، کبھی مجنوں، کبھی لیلیٰ ہوئے ہم
زندگی تجھ سے ملاقات کی خواہش تھی کسے
اُس کو دیکھا ہے تو پھر شاملِ دنیا ہوئے ہم
ہم پہ چپ رہنے کی ہمت نے ہمیں آکسایا
ایک خاموش سی تنہائی میں برپا ہوئے ہم

اور پھر اسی بحر میں قافیے کی تبدیلی کے ساتھ یہ اشعار دیکھئے:

اک توازن سے محبت میں گزاری ہم نے
پاس اپنے بھی رہے، تجھ میں بھی شامل ہوئے ہم
اب ڈبو دے یا کنارے سے لگا دے ہم کو
آج حاضر ترے دربار میں اے دل! ہوئے ہم

اگر میں یہ کہوں کہ حلیم قریشی بنیادی طور پر محبت اور زندگی کے چہرے پر اس سے پڑنے والی پرچھائیوں کے شاعر ہیں، تو بے جا نہ ہوگا۔

ایک پل میں ہوتا ہے، سانحہ محبت کا
عمر بیت جاتی ہے، داستاں سنانے میں

....

بات چلی تو اور بھی اُس کے دعوے دار ہوئے
ہم نے محبت کو برتا تو ایک مثال کیا
اپنی پہچان مجھے اُس کی محبت سے ہوئی
خود کو لکھنے جو چلا میں تو لکھا نام اُس کا

....

محبت سے مجھے جیتا ہے اُس نے
کہ دشمن ہے بہت چالاک میرا

چھوٹی بحر میں غزل کہنا بظاہر جتنا آسان لگتا ہے دراصل اتنا ہی مشکل ہے۔ دوسری طرف لمبی بحر میں غزل کہنا اس لیے مشکل فن ہے کہ اس میں ردیف کو نبھانا کارِ جاں خراش سے کم نہیں ہوتا۔ ہمیں اس مجموعہ میں ہر دو طرح کی غزلیں ملیں گی۔

"جاں ستاں" کے شاعر نے چوبیں نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل کی ہیں۔ ان کی نظموں کا مزاج غزل کے قریب تر ہے۔ دراصل میں سمجھتی ہوں کہ یہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں، مختصر قامت اور ایک منفرد مفہوم لیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظم "دُعا" نہایت پراثر اور دل پذیر و دل گداز نظم ہے۔ جو غالباً حصولِ تعلیم کے لیے ماں باپ سے دور جانے والے بچے کے لیے لکھی گئی ہے اور ماں باپ کی دُعائیں اس پر سائبان بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ تائید، تخلیق، ندا، کوئی رنگ بھرو، عدالت جیسی خوبصورت نظمیں آپ کو اس مجموعہ میں ملیں گی۔

میں کتاب کے ناشر جناب حسن عباسی جو کہ خود بھی نہایت اعلیٰ اور عمدہ شاعر ہیں کو اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

اور آخر میں حلیم قریشی صاحب کے اس شعر پر آپ سے اجازت چاہوں گی۔

میں اُس کے بعد عدم کی تلاش میں نکلا
کہا تھا اس نے مری گمرہی ادھوری ہے

عہد ساز شاعر......منیر نیازی

محمد ایوب صابر/سعودی عرب

ہر فنکار اپنے قلم سے قرطاس کے سینے پر کچھ نقوش بناتا ہے۔ یہ نقوش اپنی گہرائی کی بنیاد پر عمر پاتے ہیں۔ کوئی نقش اپنی تخلیق کے کچھ عرصہ بعد ہی بے نشان ہو جاتا ہے اور کچھ نقوش وقت کے ساتھ اور بھی گہرے اور واضح ہو جاتے ہیں۔ شہرت اور دوام ہر سخن کا مقدر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے برسوں کی ریاضت اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد منزل کا سراغ ملتا ہے۔ فکر و فن کے دشت میں برسوں آبلہ پائی کے بعد بھی کبھی کبھی کسی گھنے پیڑ کی تلاش میں عمر کا طویل حصہ گزر جاتا ہے۔ ایک ایسے تخلیق کار کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالنے کی جسارت کرتے ہوئے اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا احساس ہو رہا ہے جس نے ساری زندگی ادب کے دشت میں سخن کے لازوال پھول اُگانے میں گزار دی۔ دنیا اس تخلیق کار کو منیر نیازی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

منیر نیازی 9 اپریل 1923ء کو ہوشیار پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن کے بعد آپ نے آل انڈین نیوی میں ملازمت اختیار کر لی۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہاں آنے کے بعد آپ کا خاندان منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں رہائش پذیر ہو گیا۔ منیر نیازی کا خاندان منٹگمری میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ منیر نیازی بھی حصہ دار تھے لیکن ازلی طور پر جو شخص ایک تخلیق کار ہو وہ کاروباری نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حصص کسی دوسرے عزیز کو منتقل کر دیے۔ ان سے جو رقم حاصل ہوئی وہ کچھ تو بیرونِ شہر سے آنے والے اہل قلم کی مہمانداری پر صرف کر دی باقی رقم سے مجید امجد کے تعاون سے ''ارژنگ'' کے نام سے ایک انتہائی خوبصورت ہفت روزہ جریدے کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس میں منیر نیازی جو طنزیہ مضامین لکھتے تھے اس سے شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی ان کے جوہر کھلنے شروع ہو گئے۔ ''ارژنگ'' کے ایک صفحہ کو انھوں نے اپنے خوبصورت تیکھے جملوں کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ منیر نیازی کی شاہ خرچیوں کے باعث رسالہ چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔

اس کے بعد منیر نیازی لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں آپ کی رہائش کہیں بھی ہو، پاک ٹی ہاؤس میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ یہ وہی پاک ٹی ہاؤس ہے جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک لاہور کی ادبی ملاقاتوں کا مرکز رہا ہے۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے ٹاؤن شپ لاہور میں اپنا ذاتی مکان بنا لیا اور وہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں پیپلز پارٹی نے تھل کے علاقے میں کچھ لوگوں کو ایک ایک مربع زمین الاٹ کی، لیکن مارشل لاء لگا تو یہ الاٹمنٹ منسوخ کر دی گئی۔ ایک دفعہ سیکرٹری بورڈ آف ریونیو کی نظروں سے الاٹمنٹ کی ساری فائلیں گزریں۔ اس نے دیکھا کہ ان میں ایک فائل پر منیر نیازی کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے خاصا دھچکا لگا، اگلے روز اس نے گورنر پنجاب غلام جیلانی کی خدمت میں وہ فائل اس نوٹ کے ساتھ بھیج دی کہ جناب سیاستدانوں کی الاٹمنٹ کی تنسیخ تو بجا ہے لیکن منیر نیازی تو ایک شاعر ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ گورنر صاحب نے منیر نیازی کی الاٹمنٹ بحال کر دی۔ جب ان کو اس فیصلے سے مطلع کیا گیا تو فرمایا کہ تھل تو ایک صحرا ہے میں وہاں زمین لے کر کیا کروں گا۔ بہر حال وہ زمین فروخت کر کے اس کی رقم انھیں پہنچا دی گئی۔ منیر نیازی نے زمین نہ لینے کا درست فیصلہ کیا، صحرا تو ویسے بھی ان کے اندر تھا۔

منیر نیازی ایک ایسے شاعر تھے جو حُسن جمالات سے بھرپور طور پر آسودہ تھے۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے مقبول شاعر تھے۔

منیر نیازی عملاً ایک بے نیاز اور لا اُبالی شخص ہونے کے باوجود انتہائی خوش اطوار بے حد نڈر، خوش شکل اور خوش لباس تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ منیر نیازی کی ساری شاعری پڑھ کر جو خیال ذہن میں جا گزیں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تنہا آدمی محفل میں بھی تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی کا شجر منیر کے اندر اپنی جڑیں بہت گہری کر چکا تھا۔ داناؤں کا قول ہے کہ شہرت انسان کو تنہا کر دیتی ہے۔ یہ قول منیر نیازی پر صادق آتا ہے۔ منیر جب مشہور نہیں تھے تب بھی تنہا آدمی تھے اور جب ان کے چاہنے والے ان

گٹ ہو گئے ان کی تنہائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
تنہائی، وحشت، سائے منیر کی شاعری کی پرچھائیاں ہیں۔ منیر نیازی سے کسی نے پوچھا کہ تم لوگوں سے بیزار بھی پھرتے ہو اور اردگرد کے چہرے تمھیں بدشکل نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف تم اُمید کی باتیں بھی کرتے ہو۔ نیا شہر بسانے کے خواب دیکھتے ہو یہ تضاد کیسا ہے؟ اس کے جواب میں اُس شاعر ہفت رنگ نے کہا تھا کہ دنیا کے سارے تنہا آدمی بہت رونق چاہتے ہیں، تنہا آدمی کا یہی تو المیہ ہے کہ وہ نمک کی کان میں جا کر نمک نہیں بن سکتا۔ وہ آبادی اور رونق کے لیے روتا ہے۔ پھر وہ کسی برگد کے تلے کسی غار میں بیٹھ کر سوچتا ہے کہ رونق کیسے پیدا کی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منیر نیازی تنہائی کا شکار تھے لیکن وہ تنہا بھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

بقول اشفاق احمد لوگ بہت تھے اور وہ اکیلا۔ اس سے یہ بازی جیتی نہ جا سکی۔ سو اس نے ایک چپ اور مستقل خاموشی اختیار کر لی اور الگ تھلگ پڑ گیا۔ بس یہیں سے منیر نیازی شاعر کی حیثیت سے انگڑائی لے کر جاگا، قلم کانوں پر رکھا اور کوچۂ ادب میں پھر وارد ہو گیا۔ کسی نے کہا تھا کہ منیر نیازی کو افسانہ نگار یا مصور ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کی شاعری میں افسانے کا سسپنس اور مصوری کا طلسم دونوں باہم یکجا ہیں۔

منیر نیازی نے غزلیں، نظمیں، قطعے، گیت غرض ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور پڑھنے والوں نے ہر بار محسوس کیا کہ گویا یہ بات میرے دل میں بھی ہے۔ منیر نیازی کے الفاظ دل میں گرتے بارش کے ان قطروں کی طرح ہوتے جو کبھی گہر، کبھی اشک کی مثل اپنی جگہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ منیر کی شاعری میں عجیب طرح کی سائیکی ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کوئی نام دینا مشکل ہے۔ انھوں نے بہت سے خواب دیکھے تھے اور خواب کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ یہ خواب ان کی پناہ تھے۔ ان سب حوالوں سے منیر نیازی کے بے نیازی کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے زیادہ بے نیازی اور کیا ہوگی کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آیا۔

وہ جو میرے پاس سے ہو کر کسی کے گھر گیا
ریشمی ملبوس کی خوشبو سے جادو کر گیا
تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشم حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

منیر نیازی کی مشہور تصانیف اس بے وفا کا شہر، تیز ہوا اور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، ماہ منیر، چھ رنگین دروازے اور کلیاتِ منیر ہیں۔ ادب کا یہ لازوال محسن ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو لاہور میں آسودۂ خاک ہو گیا۔

پروین سلطانہ کے لیے ایک نظم

ڈاکٹر کوثر محمود، راولپنڈی

تمھیں کس نے کہا
بزمِ سخن اصحابِ دل سے خالی ہوتی جا رہی ہے
اِدھر دیکھو!
یہاں وارفتگی میں مسندِ ارشاد سے نیچے اتر کر کون آیا ہے،
محمد خالد آیا ہے
جلوے خاص میں جس کے

علی زریون ہے، اختر علی، عماد اظہر ہے
شناور بھی ہے، بابر بھی ہے اور ناچیز کوثر بھی
نہ جانے اور کتنے چاہنے والے،
سراپا عجز بن کر گوش بر آواز بیٹھے ہیں
چلو پروین سلطانہ شروع قائم کرو

ازل کی وسعتوں میں یہ طلسم اندر طلسم آواز
جیسے نور راولی......
لامکاں کی سرحدوں کے پار، ہر لحظہ فزوں تر ضوفشانی میں
رچاؤ غیر فانی ہے تمہاری سُر کہانی میں
سلیقہ رس میں ڈھلتا ہے تمہاری ترجمانی میں

تمہارے سُر کی پہنائی
کسی بھی حدِ امکاں سے ورا کی وسعتوں سے
آشنائی دے
تمہاری آخری سپتک پہ سرگم، نغمہ داؤد کا
پرتو دکھائی دے
تمہارے ارتقاعِ خاص کو تسلیم کرنا آج کا
دستور ٹھہرا ہے
کہ تم سُر تال کے دربار میں کتنی سہولت سے
حکومت کر رہی ہو
جبکہ واں تختِ سلیماں آخری صف میں کھڑے
لوگوں کے پاؤں
چوم کر مسرور ٹھہرا ہے
تمھیں تعظیم دینا آج کا دستور ٹھہرا ہے
چلو پروین سلطانہ شروع قائم کرو!

اپنے استنبول میں (ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ)

مصنف ہاشمی

موسم کوئی بھی ہو۔ ہوا کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ سبز پتوں سے گلے ملتے ہوئے چشموں اور ندیوں میں رواں پانیوں کی جبینیں چومتے ہوئے محوِ سفر رہتی ہے۔ یہ چاندنی راتوں میں پچھلے پہر کے گواہ شبنمی قطروں سے، اس طرح ملتی ہے کہ شبنمی تاثیر اس کے ہم رکاب چلتے ہوئے کھڑکیوں، دروازوں پر اپنے ہونے کے نشاں چھوڑ جاتی ہے۔ جسے ہم نمی سمجھ کر ذہن میں خیالوں اور ارادوں کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اصل میں وہی ہوا کا سفرنامہ ہوتا ہے۔ جس میں سورج کی حقیقت، پتوں کے گیت، پھولوں کی خوشبو، سائے کا لہجہ اور گزرتے لمحوں کی سرگوشیاں شامل ہوتی ہیں۔ اس سفرنامے کو پڑھنے کا ہنر ہر کسی کو نہیں آتا اسے پڑھنے کا ہنر تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلنے والے کے پاس ہوتا ہے یا پھر تنہائی کی گود میں اُداسیوں سے کھیلنے والی اُس صورت کی دھڑکنیں جانتی ہیں جس کی بھیگی آنکھوں نے کبھی یادوں کی تہجد قضا نہ کی ہو۔

اُردو زبان نے بڑی کشادگی سے دوسری زبانوں کو اپنے اندر سمو کر اُن کے لفظ و معانی کو خوبصورتی بخشتے ہوئے نامور دانشوروں کے ادبی سجدوں کو معراج بخشی۔ نثر کے میدان میں افسانہ، انشائیہ، کہانی کے ساتھ ساتھ اکثریت نے اپنے سفر کی روداد سفرنامے کی شکل میں لکھی۔ اس حوالے سے اگر ابو ریحان البیرونی کی کچھ تحریروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوماتی فکر و فن کے ساتھ ساتھ سفرنامے راز بھی خوبصورتی سے عیاں ہوتے ہیں۔

اسی ہوا کا جب صحرا سے گزر ہوتا ہے تو وہ ریت آڑی ترچھی لائنوں کو پڑھتے ہوئے، ان پتھروں سے بھی گلے ملتی ہے جو شاید روزِ ازل سے وہیں پڑے ہوتے ہیں۔ یہ اپنی آوارگی کی روشنی میں ساحلوں سے صحرائی ٹھنڈی چھاؤں تک پتھروں کے اردگرد منظر بدلتی رہتی ہے۔ کسی کو ریت میں دفن...... تو کسی کو ریت سے عیاں کر دیتی ہے۔ کہیں یادگاروں کی صورت ٹیلے وجود میں لاتی ہے۔ کہیں پتھروں کو بنیاد بنا دیتی ہے لیکن مسافر تو مسافر ہی رہتا ہے اور اپنی داستاں چھوڑتے ہوئے گزر جاتا ہے۔

جعفر حسن مبارک کی کتاب ''اپنے استنبول میں'' کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اُس میں ایسے پتھروں جیسے چہرے نظر آتے ہیں جو خیر کی پوشاک پہن کر حق کی گردنیں کاٹتے نظر آتے ہیں۔ شام کے منظروں میں مصنف نے ترکوں کے زوال سے عروج کی تاریخ لکھتے ہوئے کچھ ایسے کردار بھی واضح کیے جو صرف ترک وادیوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب بے شک پڑھے جانے کے لائق ہے لیکن موجودہ دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی مسکراہٹ تو بہت خوبصورت ہے لیکن اُن کے لوہے کے دانت ہیں ''اپنے استنبول میں'' طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ تاریخی حوالوں کی تشریح جعفر حسن نے اس طرح کی ہے جس سے قاری اُلجھاؤ کا شکار نہیں ہوتا۔

اس کتاب میں فریب ساحل سے گمان حساب تک قصرِ راز کے گرد بھڑکتی آگ کی روشنی میں معاہدے نظر آتے ہیں۔ سوچ اور فکر کی تصویریں تصور میں ہل چل مچاتے ہوئے وصال کی تربیت گاہ میں صنعت و امکان کے طلسمات کی سیر کراتی ہیں۔ اس کتاب کا خالق روایتی نثر کا قائل نظر نہیں آتا۔ بلکہ مختلف شعراء کے اشعار کے ساتھ ساتھ وہ اساتذہ کے اشعار سے دبے پاؤں اُترتی شفق کے زاویوں میں شام اور رات کے گلے ملنے کے منظر کو دھڑکنوں کے گیت میں سمو کر پانیوں پہ تیرتی روشنیوں اور مسجدوں کے میناروں سے پھوٹتے نور سے منسلک صحیفوں کی تشریح کرتی ہے اگر معلوماتی ذہن کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو گمشدہ صبحوں اور شاموں کے راز مقدس ہستیوں کی یادگاروں کی دہلیز سے ساحلوں تک کی جان کاری موجود نظر آتی ہے۔ ستاروں کی چال میں آئینے اتاترک کے جذبہ حریت تک اس نے ''اپنے استنبول میں'' تمام راز و نیاز اور شرائط جو عام قاری کی سوچ سے دور تھیں انھیں نیم کلاسیک افسانے کا رنگ دیتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں لکھا۔ اس کتاب میں مختلف سفرناموں کی طرح مذاہب یا لسانیات کے بھاری بھرکم مسئلے سے گریز کرتے ہوئے ان حوالوں کا ذکر موجود ہے۔ جو تکنیکی اعتبار سے ضرور تھا۔ اقتصادی اور معاشی طور پر ترکی کی ترقی میں کون لوگوں کا ہاتھ تھا؟ وہ بھی تفصیل سے موجود ہے۔ کسی بھی واقعے کو غیر ضروری طوالت کا شکار نہیں کیا گیا۔ یہ سادہ سے اسلوب میں عربی کے زاویوں پہ فارسی قوسیں کھینچتے ہوئے ترکی زبان میں مثالیں دے کر اُردو کی شالیں نہیں۔ اس سفرنامے میں موصوف نے تاریخی عمارتوں میں جلوہ افروز میوزیم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں قدیم اور جدید حیثیت کا تقابلی جائزہ بھی لکھا ہے۔ اکثر جگہوں پر مکالماتی انداز میں معلوماتی بحث کا رنگ ضرور نظر آتا ہے۔ یہ کتاب شگفتہ تاثیر لیے تازہ احساس میں ڈوبا شستہ ہنر مندی کا لب و لہجہ ہے۔ جس کی!

اہلِ وفا...... ہواؤں کے شور میں!\
سرمئی دائروں میں سبز حقیقت بیان کرتے ہیں\
خوبصورت پرندوں کے ساتھ!\
چاندانی راتوں میں کنول زادی کے منتظر رہتے ہیں\
خوشبو کے ہمزاد کی مٹھی میں\
معنوی روشنی کے جگنو دیکھتے رہتے ہیں\
پہچان کی راہوں میں گلاب کھلتے رہتے ہیں

حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ کلام ''سائیں''

محمد نوید مرزا

حسن عباسی سے میرا تعارف آج سے تقریباً بیس اکیس سال پہلے اُن کی کتاب ''جگنو میری سوچوں کے'' ذریعے ہوا۔ یہ غالباً 95-1994 کی بات ہے جب میں ماہنامہ ''ادب لطیف'' کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں میں خود بھی نوجوان تھا اس لیے نوجوان شاعر حسن عباسی کا کلام بڑے شوق سے پڑھا اور اُن کی شاعری کو ان کی عمر اور تجربے کے اعتبار سے معیاری اور متوازن پایا لیکن اس وقت میری ان سے کوئی بات یا ملاقات نہیں ہوسکی۔ کیونکہ وہ ان دنوں اپنے شہر میں تھے۔ چند برس قبل خبر ملی کہ حسن عباسی لاہور آ گئے ہیں اور انھوں نے نستعلیق مطبوعات کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا ہے لیکن چونکہ میں نے ادب سے راہِ فرار اختیار کی ہوئی تھی اس لیے میں اُن سے مل نہ سکا۔ تاہم پچھلے چند ماہ سے جب میں نے ادبی تقریبات میں جانا شروع کیا تو وہاں اکثر ان سے ملاقات ہو جاتی تھی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تو انھوں نے مجھے اپنے دفتر آنے کی دعوت دی۔ اس طرح ان سے دوستی کا آغاز ہوا اور اگلی ملاقاتوں میں، میں نے انھیں ان کی کتاب ''جگنو میری سوچوں کے'' پیش کردی، جس کی ان کے پاس ایک کاپی بھی نہ تھی۔ میں نے ان سے ان کی دوسری کتابیں مانگیں تو انھوں نے کمال محبت سے مجھے اپنی سفرناموں پر مشتمل دو کتابیں ''محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو'' اور ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' عنایت کیں۔ ابھی میں ان سفرناموں کا جستہ جستہ مطالعہ ہی کر سکا تھا کہ انھوں نے اپنے حمدیہ مجموعہ کلام ''سائیں'' کا نسخہ مجھے پیش کر دیا۔ حسن نے ''سائیں'' کے ذریعے خدائے پاک سے مکالمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حمد اور نعت لکھنا ایک مشکل ترین کام ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ ہمارے شاعر پر یہ قلبی واردات کسی تخلیقی لمحے میں روحانی طور پر اتنی سہولت اور آسانی سے وارد ہوئی کہ اسے خود بھی خبر نہ ہوئی کہ کب یہ شعری مجموعہ ورطۂ تحریر میں آیا اور کب مکمل ہو گیا۔

کوئی قبولیت کی گھڑی تھی، آنکھوں سے بارش ہوئی، گناہوں کی معافی مانگی گئی، باطنی طور پر قلب میں نور بکھرنے لگا۔ اندھیرے کی سلیں ٹوٹنے لگیں تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں نہائے ہوئے حسن عباسی خوش قسمت ہیں کہ ایک کائنات نے ان پر نظرِ کرم فرمائی اور انھیں اپنی حمد سرائی کے لیے منتخب کیا۔ یہ ایک بہت بڑی سعادت ہے جو حسن عباسی کو حاصل ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں حسن اس وقت اردو کے اوّلین حمد گو شاعر بن چکے ہیں جنھوں نے ایک ہی ردیف میں پانچ طویل حمدیں تحریر کیں اور انھیں کتابی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ میرے نزدیک نئے شعری تجربات کے لیے فنکارانہ پختگی اسلوب اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ ساتھ جذبوں کا پھیلاؤ اور کسی حد تک جنون کا ہونا بھی ضروری ہے۔ شاعری ایک طرح سے ایک جنون ہی ہے اور اس کا رخ جس موضوع کی طرف موڑ دیا جائے شاعر خود کو اسی دھارے میں بہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس دیوانگی کو ''سائیں'' کے دیباچہ میں غلام حسین ساجد نے بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے شاعر کو دیوانہ اور اُس کے تخلیقی وفور کو شاعر کا طرزِ جنوں قرار دیا ہے جس کے زیرِ اثر حسن عباسی نے زیرِ تبصرہ مجموعے کو تخلیق کیا ہے۔ غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

''حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ کلام ''سائیں'' اسی طرزِ جنوں سے پیدا ہونے والی مستی کی عطا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مستی مستور ہے نہ من و تو کی حدوں تک محدود بلکہ یہ تو ایک مجذوبی لہر کی طرح آزاد، خودرو اور کسی حد تک بے مہار ہے۔ اس نے شاعر اور خالقِ کائنات کے مابین ایک انوکھے مگر اٹوٹ رشتے کی تعمیر کی ہے جو اظہار کی ہر صورت کو سمیٹنے اور پھیلانے کی طاقت رکھتا ہے۔

حسن عباسی کی یہ طویل حمدیں ایک ایسی شعری داستان ہے جس میں مختلف رنگوں کے پھول کھل کر اپنی مہک چاروں طرف پھیلا رہے ہیں۔ شاعر اپنے شعری اظہار میں ہمہ وقت مصروفِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ کہیں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدہ ریز ہے۔ کہیں دعاؤں اور عبادات کا ورد جاری ہے تو کہیں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کا رونا ہے تو کہیں اس کے ہونٹوں پر شکوہ ہے۔ کہیں اشکوں سے بہتے ہوئے دھارے گناہوں کی سیاہی کو تیزی سے بہائے لیے جا رہے ہیں تو کہیں کائنات کی پوشیدہ رمزیں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کہیں مالک کائنات کی جابجا بکھری مصوری پر خوشی کا اظہار ہے تو کہیں اس ذات پاک کی تسبیح کے ذریعے مشکلات کے حل کی نوید دی گئی ہے۔ یہ عام روایت سے ہٹ کر جدید طرزِ احساس کی شاعری ہے جسے پڑھنے والا خود بھی ایک روحانی کیفیت سے گزر سکتا ہے۔ بقول عطا الحق قاسمی، حسن کے حمدیہ مجموعے ''سائیں'' کا نام بھی اپنے اندر گہری وسعت رکھتا ہے جو کہ انسان اور خدا کے اُلجھے ہوئے ازلی تعلق کو مزید اُلجھاتا نہیں ہے۔ حمد میں حسن عباسی کا جس خدا سے مکالمہ ہے وہ ''سائیں'' کی ردیف میں مزید وسعت اور گہرائی اختیار کر گیا ہے۔ اللہ کے ۹۹ ناموں میں جو صفات بیان کی گئی ہیں حسن عباسی کی ہر حمد کے ننانوے شعر ان صفات سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں۔

عطا صاحب کی اس رائے کے بعد آیئے حسن کے چند شعر پڑھیں:

کائناتیں دکھا دے پوشیدہ
کھول اپنی پٹاریاں سائیں

....

سر پٹختے ہیں تیری چوکھٹ پر
کیا تجھ گزاریاں سائیں

....

حمد کے نام پہ لکھی میں نے
تیرے نام اک چٹھی سائیں

....

ایک الف ہی لکھا میں نے
جب بھی تختی سیکھی سائیں

....

تیری حمد سنی ہے میں نے
جب بھی کوئل بولی سائیں

شاعر اس بات سے پوری طرح آگاہ ہے کہ پرندے بھی خالق کائنات کی حمد گاتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے کوئل کو استعارہ بنا کر پوری دُنیا کے ان پرندوں کی بھی نمائندگی کر دی ہے جو ہر وقت خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ بلکہ غور کیا جائے تو آج کے انسان کے علاوہ ہر ذی روح شے خدا کی تعریف میں مصروف عمل ہے۔ انسانوں میں جو چیدہ چیدہ افراد دل سے خدا کی حمد میں مصروف ہیں اُنھی میں ایک خوش قسمت انسان حسن عباسی بھی ہیں جو اپنی نئے لفظوں پر مشتمل شعری دنیا بسا کر بڑی خوبصورتی اور روانی سے خدا کے حضور دعا کی چھتری لیے کھڑے ہیں۔ ان کے الفاظ سادہ و شفاف مگر رواں دواں ہیں۔ بقول محمد اظہار الحق:

حسن عباسی نے ایسی ڈھلی ڈھلائی اُجلی لفظیات استعمال کیں کہ پڑھتے ہوئے کورے برتن کی سوندھی سوندھی خوشبو دماغ تک جاتی محسوس ہی نہیں ہوتی نظر بھی آتی ہے۔ اُڈاریاں، میگھ ملہار، ساجھے داریاں، ناکیاں، چھلے، جھوک، جھگی، کچا کوٹھا، پوچا، پہاڑا، بوکا، کونجی، چھائیاں اور ایسے بے حد نئے نویلے، نکھری کیے، سوہنے، چمکدار، لفظ کہ دل میں اُترتے جائیں اور اُردو کے غزل پر کنوارے ان چھوئے پھول ٹانکتے جائیں۔

اظہار صاحب کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے حسن عباسی کے چند ڈھلے ڈھلائے شعر پڑھیں:

میں ہوں کچا کوٹھا سائیں
مار کسی دن پوچا سائیں

....

ساری عمر پڑھا ہے میں نے
تیرا ایک پہاڑا سائیں

....

جب سے پیدا ہوا ہوں تب سے
کھینچ رہا ہوں بوکا سائیں

....

اپنی منت گزاریاں سائیں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں

....

تیرے جھکڑ چلتے ہیں جب
گر جاتی ہے جھگی سائیں

....

ہاتھ کی ہر اُنگلی میں پہنے
تیرے نام کے چھلے سائیں

مجھے حسن عباسی کے اس مجموعے میں کہیں کہیں خدا کے حضور شکوے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے شکووں پر عام قاری کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بظاہر خدا کے حضور شکوہ کرنا کوئی پسندیدہ عمل نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کہ شکوہ ہمیشہ اپنوں سے ہوتا ہے اور خدا سے بڑھ کر ہمارا اپنا کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے عظیم قومی شاعر حضرت علامہ اقبال نے جب اپنی مشہور زمانہ نظم ''شکوہ'' تخلیق کی تو اقبال مخالف دھڑے نے ان کے خلاف کمر کس لی تھی جس پر انھیں ''جوابِ شکوہ'' لکھنی پڑی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حسن عباسی کو بھی ''سائیں'' کا دوسرا حصہ لکھنا پڑا تو وہ یہ کام آسانی سے کر گزریں گے۔ کیوں کہ وہ ایک سچے اور جینوئن شاعر ہیں۔ ان پر شعر وارد ہوتے ہیں تو وہ انھیں پوری تخلیقی قوت سے صفحہ قرطاس پر اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ آیئے حسن کے ان موضوعات پر چند شعر دیکھیں:

جنم جنم کے کمزوروں پر
کیوں ہوتے ہو غصے سائیں

....

تو نے ہم سے، ہمارے بچوں سے
محنتیں ہی کرائیاں سائیں

....

آسمانوں سے تو نہیں اُترا
ہم نے آنکھیں تھکائیاں سائیں

....

کچھ تو ان کو بتا کہاں جائیں
جو ہیں تیری ستائیاں سائیں

....

دیکھی ہے تاریخ اُلٹ کر
تو ہے بڑا بے دردی سائیں

....

لیکن آخرکار وہ یہ بھی کہتے ہیں:

تیرے علاوہ کس سے کروں میں
پیار بھرے یہ شکوے سائیں

خدا کرے حسن عباسی کا یہ مجموعہ کلام بارگاہ خداوندی میں قبولیت حاصل کرے۔ کیوں کہ انسان تو خطا کار ہے اور خدا معاف کرنے والا ہے اس لیے اگر شاعر سے بھی شکوہ کرتے ہوئے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کتاب کا آخری شعر ساری کتاب کے خلاصے کے طور پر کتاب میں درج ہے:

تیرے علاوہ کون اُٹھائے
میری ذات کا کچرہ سائیں

وہ خدائے عظیم و برتر ہے۔ ہم میں نور کی مشعلیں تقسیم کرتا ہے اور ہم اپنی ذات کا کچرہ اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کاش ہمیں حقیقی معنوں میں اُس رستے پر چلنے کی توفیق عطا ہو جو خدا کا بتایا ہوا ہے۔ آمین

نورِ برحق کے جلوؤں میں گم شاعر۔صاحبزادہ رشید عثمانی

محمد امین ساجد سعیدی حاصل پور

ممدوحِ کائنات کی مدحت سرائی کا سلسلہ ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔ آسمانی صحائف میں آپ کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ بلاشبہ نعت ہی ہے۔ قرآنِ پاک میں ورفعنا کی آیتِ مبارکہ نعت کے اثبات پر دال ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمانِ ذیشان کہ حسان میرے منبر پر بیٹھ کر میری نعت سناؤ۔ فروغِ نعت کے سلسلہ میں آپ کا ارشادِ گرامی نعت گویاں کا مقدر بن گیا ہے۔ مدحتِ رسول عربی کے لیے نعت کے لفظ کے مبتداء حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا ہیں ان کی لسان فصاحت و ولایت نعت کی عظمت و توقیر اور نعت کے اولین و آخری شعراکرام کے لیے حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ نے یہ اعزاز اور اعجاز صنفِ سخن کی ہر ہیئت کو عطا کیا ہے یعنی مسدس، نظم، آزاد نظم، غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی وغیرہ کے آہنگ میں نعت کہی جاتی ہے۔ اب تو اردو میں نعت نے باقاعدہ ایک مستقل صنف کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔

نورِ برحق صاحبزادہ رشید عثمانی صاحب کا پہلا مجموعہ نعت ہے۔ انہوں نے غزل کے پیکر میں ایک حمدِ باری تعالیٰ اور چھپن (56) نعتیں کہہ کر نعت گو سعادت مندان میں شامل ہوئے ہیں۔ مکمل دیوان میں 604، اشعار رقم کیے ہیں۔ 10 غیر مردّف نعتوں نے شعری حسن میں رنگ بھر دیے ہیں۔ محاورات کسی بھی زبان و بیان کا نکھار و وقار ہوتے ہیں ادب میں محاورات کو مخصوص مقام حاصل ہوتا ہے۔

عثمانی صاحب نے اپنے کلام میں جہاں ضرورت محسوس کی اپنے اشعار میں محاورات کو صحیح مقام پر برمحل استعمال کر کے کلام کو حسن و دلکشی کے کمال پر پہنچادیا ہے۔

روضہ رسول ﷺ کے گرد کبوتروں کے اُڑنے کا تصور عقیدت مندانہ پہلو کا حصہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر گنبدِ خضریٰ کے سائے میں کبوتر کی یاد نے زائرِ مدینہ کے اندر تڑپ اور لگن کے جذبات کو جو راحت و تسکین بخشی ہے۔ اس کا احوال درج ذیل شعر میں سامنے آجاتا ہے۔

دیکھنے والوں کی نظریں گھومتی ہیں ساتھ ساتھ
آپ ﷺ کے روضے کے گرد اُڑتے کبوتر دیکھنا

صاحبزادہ رشید عثمانی صاحب کی قادر الکلامی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے ردیف کا بوجھ محسوس نہیں کیا اور نہ ہی قافیے کی اُلجھنوں میں اُلجھے ہیں۔ اکثر نعتوں میں دو دو، تین تین مطلع نہایت مہارت و برجستگی کے ساتھ رقم کیے ہیں جس نے نعتیہ دیوان کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ قاری کو اشعار اپنی گرفت میں جب لیتے ہیں تو عقیدت کی چاشنی بھی عطا کرتے ہیں۔ ایک ایک شعر سے مفاہیم و مطالب کے خزینے اور نگینے چمکتے دکھتے نظر آتے ہیں۔ نورِ برحق میں بے شمار اشعار سے بہت سے موضوعات اور عنوانات سامنے آتے ہیں چند عنوانات کی فہرست درج ذیل ہیں:

(۱) نبی پاک ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کا ذکر
(۲) نبی پاک ﷺ کی نورانیت و بشریت کا تذکرہ
(۳) نبی پاک ﷺ کے میلاد منانے کا بیان
(۴) نبی پاک ﷺ کے حسن و جمال کا بیان
(۵) نبی پاک ﷺ کے معراج کا ذکر کیا گیا ہے۔
(۶) نبی پاک ﷺ کے شہر مدینہ کی زیارت کی آرزو کرنا۔
(۷) نبی پاک ﷺ کی رحمت بے کنار کا بیان۔
(۸) نبی پاک ﷺ کے معجزات کا ظہور اور دعوت دین کا بیان۔
(۹) نبی پاک ﷺ کی ختم نبوت کا بیان۔
(۱۰) نبی پاک ﷺ کے آل و اصحاب کا بیان
(۱۱) نبی پاک ﷺ کی بارگاہ میں استغاثہ و استمداد کا بیان

کلام میں سلاست و روانی، استعارات و تشبیہات، وارفتگی و شیفتگی اور صنائع بدائع سے جو آرائش زیبائش پیدا ہوئی ہے۔ اس سے شاعر کی پختہ کاری اور ماہرانہ گرفت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ چند ادبی صنعتوں کے نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

صنعتِ تلمیح: صنعتِ تلمیح کے استعمال سے شاعر کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔ نورِ برحق میں رشید

عثمانی صاحب کے مجموعے میں بہت سے اشعار اس صنعت میں کہے گئے ہیں جن کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

خدا کو وہ مقبول ہے شین بن کر
اگر سین کہہ دیں بلال محمد ﷺ

برسر اقصیٰ امامت ہے تری
عرش پر بھی جا کے تو مہمان ہے۔

صنعت تضاد: نور برحق میں یہ صنعت بہ کثرت استعمال ہوئی ہے۔ اس صنعت کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

نہیں جچتے نگاہوں میں ہماری تاج سلطانی
کہ ہم کو باعث عزت ترے در کی گدائی ہے

ہو گیا ظلمت کا دامن تار تار
ہر طرف پھیلی ضیائے مصطفیٰ

ختم ہونے میں کسی طور نہ صحرا آیا
نام جب تیرا لیا سامنے دریا آیا

تجنیس سرحرفی: نور برحق میں تجنیس سرحرفی کے اسلوب سخن کی نادر کاری کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ درج ذیل دو اشعار میں اس اسلوب سے حظ اُٹھاتے ہیں۔

گہرا ہے مرے دل پہ ترا نقش محبت
تعظیم تری تیرا ادب ذہن نشیں ہے

اس میں تعظیم، تری، تیرا، میں ''ت'' سے سرحرفی تجنیس پیدا کی گئی ہے۔

تجھ پہ مرے حضور نے آ رکھے ہیں قدم
عرش عظیم دیکھ تو عظمت حضور کی

تجنیس صوتی: مجموعہ نعت فن گوئی کا عمدہ اضافہ ہے۔ نعتیہ اشعار میں صاحب کتاب نے صوتی حسن کو نہایت خوبصورتی سے برقرار رکھا ہے۔ دو اشعار اسی حوالے سے خاطر نشین کرتے ہیں۔

وہ کریم آیا تو تکریم بشر ہونے لگی
زندگی نامعتبر تھی معتبر ہونے لگی

شیدا ہے خدا جس پہ تو وہ ماہ مبیں ہے
تو سارے زمانے کے حسینوں سے حسیں ہے

نور برحق میں جہاں تمام فنی خوبیاں موجود ہیں وہیں ترکیب سازی کے بہترین نمونے بھی کتاب کے مطالعے میں دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ بارگاہ رسالت میں حسین وجمیل لفظوں کی ترکیبوں اور بندشوں کو عاجزی وانکسار کے دامن کو تھامتے ہوئے شاعرانہ مشاقی کا اظہار یہ ہے کلام میں قرآنی الفاظ خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں۔ چند اشعار ذیل میں پڑھ کر حظ اُٹھاتے ہیں۔

تیری تعریف لکھتا ہوں ترے اوصاف پڑھتا ہوں
تلاوت رات دن کرتا ہوں میں یٰسین و طٰہٰ کی

سورہ و النجم کا مفہوم یہ سمجھا ہوں میں
تیرے رُخ سے ہر طرف جلوہ نما ہے روشنی

صاحبزادہ رشید عثمانی صاحب کے پیش نظر سہل کاری بھی ہے اور مشکل ردیفوں اور زمینوں میں بھی ان کی نعتیں ملتی ہیں۔ تین اشعار اس مثال کے لیجیے کہ کس شاندار اور کہنہ مشقی سے کہے گئے ہیں۔ اس میں فارسی ادب کے بلند پایہ شاعر امیر خسرو کے معروف کلام:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

کی ردیف شب جائے کہ من بودم کا ''کل شب جہاں میں تھا'' اردو ترجمہ پرگوئی کے ساتھ پوری نعت میں نبھایا گیا ہے۔

زمیں تھی نازش صد گلستاں کل شب جہاں میں تھا
زمیں پر جھک رہا تھا آسماں کل شب جہاں میں تھا

مری آنکھوں کے آگے گنبد خضریٰ کا تھا منظر
نہ تھا کوئی ہمارے درمیاں کل شب جہاں میں تھا

رشید اس در پہ سر رکھ کر پڑھی میں نے ثنا اُن کی
بہت تھا وقت مجھ پر مہرباں کل شب جہاں میں تھا

صاحبزادہ رشید عثمانی صاحب روایت سے جڑے ہوئے نعت کے ادب و احترام سے مملو اشعار کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کو شعر وسخن کا سرمایہ ورثے میں ملا ہے اور اسی نسبت کے معیار و وقار کا پاس رکھتے ہوئے خوبصورت اشعار کہتے نظر آتے ہیں۔ آخر میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ رب کائنات رشید عثمانی صاحب کو صحت و سلامتی کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور اُن کا نعتیہ دیوان نور برحق کو رسالت مآب کی جناب میں شرف قبولیت فرمائے اور شہرت دوام سے نوازے۔ آمین

کیا پیو گے؟

عطاء الحق قاسمی

لاہور ریلوے سٹیشن پر جب تمام رکشہ ڈرائیوروں نے مجھ نالائق کا "بارامانت" اٹھانے سے انکار کر دیا تو میں اور حسنین جاوید ذرا پرے کھڑی ویگن میں جا کر بیٹھ گئے جس میں ہمارے علاوہ تین مسافر اور تھے۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور منی بس میں مسافروں کے بے پناہ ہجوم سے متعلق بے بنیاد افواہوں پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں چند مسافر اور آگئے اور یوں منی بس قریباً بھر گئی ڈرائیور کے برابر والی نشستیں خالی تھیں لیکن کچھ ہی دیر بعد دو خواتین وہاں آکر بیٹھ گئیں اور یوں ویگن کی بارہ نشستیں مسافروں سے پُر ہو گئیں۔ کنڈیکٹر ابھی تک دروازے کے ساتھ کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ میں نے بھری ہوئی ویگن کی طرف اشارہ کیا اور اسے چلنے کو کہا۔ اس پر کنڈیکٹر کے چہرے پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا کہ حضرت: آپ خاصے چغد واقع ہوئے ہیں۔ اتنے میں چند مسافر اور آگئے۔ کنڈیکٹر نے ویگن میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو حکم دیا کہ وہ سکڑ جائیں سو وہ سکڑ گئے۔ اب ویگن میں بارہ کے بجائے سولہ مسافر تھے لیکن کچھ اس طرح کہ انہوں نے اپنے کندھے سکیڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ کھلے ہونے کے باوجود بندھے ہوئے تھے؛ چنانچہ ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ٹکٹ کے لیے پیسے نکالنے کی خاطر اپنی یا کسی دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈال سکیں۔

میرا دم گھٹنے لگا تھا؛ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کنڈیکٹر سے چلنے کی درخواست کی۔ اس بار اس نے مسکراہٹ کی دولت مجھ پر نچھاور کرنے کے بجائے الفاظ کے موتی بکھیرے اور کہا:

"صاحب جی! ویگن بھرے گی تو چلیں گے، خالی ویگن کیسے لے جائیں؟"

اتنے میں پانچ مسافر مزید آگئے۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی:

"سکڑ جائیں!"

سو لوگ سکڑ گئے اور اب بارہ نشستوں کی ویگن میں اکیس بے زبان سوار تھے۔ دریں اثنا دو مسافر اور آگئے۔ اس بار کنڈیکٹر نے از راہ کرم کسی کو سکڑنے کا حکم نہیں دیا۔ ایک مسافر پہلے سے بکری بنا کھڑا تھا۔ یہ دو بکریاں بھی اس کے ساتھ متوازی کھڑی ہو گئیں۔ اب دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ کنڈیکٹر اس ادھ کھلے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور ۲۳ بھیڑ بکریوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالنے کے بعد اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا:

"صاحب جی! آپ ناراض نہ ہوں ہم چل پڑتے ہیں۔"

ظاہر ہے کنڈیکٹر کی اس خوش اخلاقی کے بعد ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز اس نے جس خوش اسلوبی سے مسافروں کی پیکنگ کی تھی اس نے ناراض ہونے کی گنجائش ویسے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ سو صورت حال کچھ یوں تھی کہ میرے سامنے والی نشست پر پانچ مسافر بیٹھے تھے۔ یہ نشست ایک پھٹے پر مشتمل تھی اور یہ پھٹا وہاں بنایا گیا تھا جہاں ہماری نشست کے مسافروں کے لیے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ تھی؛ چنانچہ اب اس پھٹے کے مسافروں کی ٹانگیں شرمناک انداز میں "من تو شدم تو من شدی" ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف بائیں جانب بکریوں کی طرح جھکے ہوئے انسانوں کی "سریاں" ہمارے سروں پر سایہ فگن تھیں اور گاہے گاہے ان کے "پائے" ہمارے پاؤں پر آجاتے تھے۔

ہماری نشست پر انتہائی بائیں جانب بیٹھا ہوا شخص ہم سے زیادہ عذاب میں تھا۔ اس کا سر قدرت کی طرف سے منڈا ہوا تھا اور چندیا لشکارے مار رہی تھی۔ چلتے چلتے جب ویگن ڈرائیور اچانک بریک مارتا تو اس کے برابر میں بکری بنے مسافروں میں سے کسی ایک کا ہاتھ سہارا لینے کے لیے ٹھاپ کی صورت میں اس کے سر پر پڑتا اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

میرا دم گھٹتے گھٹتے "گھٹنے" کے قریب پہنچ گیا تھا، سو میں نے مزنگ چونگی کے قریب ڈرائیور کو بریک لگانے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی جس کے ساتھ ہی ٹھاپ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ میں پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد اس شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور پھر ویگن سے باہر کھڑے ہو کر میں نے کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا اپنے ایک انقلابی دوست کے پاس گیا اور کہا:

"آج سے میں بھی انقلابی ہوں۔ آؤ مل کر مسلح جدوجہد کا آغاز کریں اور نعرہ لگائیں کہ دنیا بھر کے ویگن مسافرو! ایک ہو جاؤ"۔

میرے انقلابی دوست نے یہ سن کر ۵۵۵ کا سگریٹ سلگایا۔ ڈرائیور کو کار سروس کے لیے لے جانے کا حکم دیا اور پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا:

"میرا اور تمہارا طبقہ الگ الگ ہے۔ میں مزدوروں اور کسانوں کا ساتھی ہوں تم سرمایہ داروں کے رفیق ہو۔ ہمارا تمہارا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ خیر چھوڑو۔ دن ڈھلنے کو ہے کیا پیو گے؟"

آل ویز ویلکم

حافظ مظفر محسن

شکریہ۔۔۔

میں نے ''آل ویز ویلکم'' کے جواب میں کہا۔۔۔تو وہ نوجوان مسکرا دیا۔۔۔اُس نے ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا تو میں نے بھی بادلِ نخواستہ ''شیک ہینڈ'' کیا تو اُس نے ہاتھ پکڑے پکڑے تعارف کرانا شروع کیا۔۔۔

''میں سر ملا خان داد سرخیلی پشاور سے ہوں۔ میں نے دو بار میٹرک کیا ہے۔۔اک بار پشور سے، اک بار لاہور سے۔۔۔ (میری اُس سکیورٹی گارڈ میں دلچسپی بڑھ گئی۔۔!)

''یا اللہ خیر۔۔۔'' میرے منہ سے نکلا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے دو ایم۔اے کر رکھے ہیں اور میں اس پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنے دو ایم۔اے ایسے لگتے ہیں جیسے میں نے دو شادیاں کر رکھی ہوں (آج کے دور میں بظاہر دو شادیاں محبوب سمجھی جاتی ہیں اور درپردہ چالیس فیصد مردوں نے یہ ''محبوب'' کام کر بھی رکھا ہے)۔ مجھے ہمیشہ دو ایم۔اے کرنے والے (اپنے سمیت) بُرے لگتے ہیں۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ بندہ کسی ایک مضمون میں ایم۔اے کر لے پھر اُسی مضمون میں مزید کوئی اعلیٰ ڈگری لے لے یا صبر شکر کر کے بیٹھ جائے۔۔۔کیونکہ استاد کر کمائی جہاں بھی جا کے اپنا تعارف تین ایم۔اے کے ساتھ کرواتا ہے لوگ اسے کئی بار سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں۔۔۔

یہاں تو ملا خان داد سرخیلی مل گیا جو چار گلیوں کا اکیلا ہی چوکیدار ہے اور خیر سے اُس نے دو بار میٹرک کر رکھا ہے۔۔۔ ہے ناں ''بدمزگی'' کی بات۔۔۔

''آل ویز ویلکم''۔۔۔ (میں نے سنجیدگی سے کہا)۔۔۔آپ نے خیر سے یہ دو بار میٹرک کیوں کیا۔۔۔کیا پشاور میں کوئی فاونٹین ہاؤس جیسا ادارہ نہیں ہے۔۔۔؟'' اُسے میرا اس سوال میں چھپا طنز سمجھ نہ آیا۔۔۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب میں پھر بڑی گرمجوشی سے کہا۔۔۔

''آل ویز ویلکم جی''۔۔۔میں سمجھ گیا کہ ملا خان داد سرخیلی کو گائیڈ کرنا چاہئے۔۔۔بنیادی طور پر یہ اس پیشے کے لیے فٹ نہیں ہے جو اس نے اپنا لیا ہے۔۔۔اُس کی نظروں میں ''حیا'' ہے۔۔۔ وہ چوروں/نوسربازوں کی بھی احترام سے ملتا ہو گا۔۔۔میں نے دل ہی دل میں سوچا۔۔۔

مجھے ''جنت'' یاد آ گئی (مجھے بڑی دفعہ یہ خواہش ہوئی ہے کہ میں والدین سے کہوں کہ ایسے نام نہ رکھا کریں جن کا تذکرہ کرتے ہوئے بندے کو ادب احترام کرنا پڑتا ہے اور ہزار دفعہ اچھی۔۔۔ بری بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے لیکن کیا کریں۔۔۔''جنت'' ہمیں بہر حال عزیز تو ہے ناں۔۔۔؟)

مہینے دو مہینے بعد اُس کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ غصے میں جو منہ پر آئے کہہ دیتی ہے بولتی چلی جاتی ہے جب آپ ترکی بہ ترکی جواب نہ دیں تو ایک گھنٹے میں چپ کر جاتی ہے اور اگر آپ جواب سوال کے چکر میں پڑ جائیں تو پھر تین چار گھنٹے اس کا پارہ چڑھا رہتا ہے اور دادا جان جو غلطیاں کر کے دنیا سے چلے گئے وہ بھی آپ کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے اور آپ کا بھرکس نکال دیتی ہے۔۔۔اگر اُس کی بہت سی تلخ باتوں پر چپ رہیں اور مذاق میں کہیں کہ ''۔۔۔اور کچھ۔۔۔'' تو ہنس دیتی ہے اور غصے میں کہتی ہے۔۔۔''آل ویز ویلکم'' اور آپ شرمندہ ہو جاتے ہیں۔۔۔اور پھر محبت سے رونے لگتی ہے۔۔۔

اس سال ٹریجیڈی یہ ہوئی کہ جس دن اُس کا میٹرک کا رزلٹ تھا اُس دن اُس کی سالگرہ بھی تھی۔۔۔نہ (میرے سمیت) کسی نے سالگرہ پر ''وش'' کیا نہ ہی رزلٹ پر مبارک دی (بھلا فیل ہونے پر بھی مبارکباد بنتی ہے۔۔۔؟)

ملا خان داد سرخیلی نے بتایا کہ میں نے پشاور بورڈ سے میٹرک کا امتحان دیا تو لاہور یہ ''جاب'' مل گیا اور میں بھول گیا۔۔۔کہ رزلٹ بھی آئے گا۔۔۔لاہور آ کے میں نے سوچا بڑے شہر میں آ گیا ہوں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینی چاہئے۔ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دوں۔۔۔؟ لاہور بورڈ سے میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور پھر بھول گیا۔۔۔

ایک سال بعد میں پشور گیا تو اماں نے بتایا کہ مبارک ہو تمہارا میٹرک کا رزلٹ آیا پڑا

ہے۔۔۔میں نے خوشی خوشی رزلٹ کارڈ چیک کیا تو بڑی خوشی ہوئی کہ میں دونوں مضامین اردو اور انگلش میں پاس تھا۔۔۔

اور باقی مضامین۔۔۔؟؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔۔۔تو اُس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔۔۔مظفر صاحب وہ بھلا زندگی میں کہاں کام آتے ہیں۔۔۔؟؟ (اب الجبراء کا چوکیدارے سے کیا تعلق۔۔۔؟) اردو اور انگلش میں پاس ہو جانا ہی کافی ہے۔۔۔پھر میں چھٹی گزار کے واپس آیا تو یہاں بھی رزلٹ کارڈ پڑا تھا۔۔۔کیا حسن اتفاق ہے کہ لاہور بورڈ نے بھی مجھے پاس کر دیا۔۔۔یہاں بھی بورڈ کے عملے میں لگتا ہے کچھ اچھے لوگ ہیں۔۔۔؟

صرف اردو اور انگلش میں۔۔۔؟؟ میں نے پوچھا تو وہ ہنس کے بولا۔۔۔آپ نے ٹھیک سمجھا۔۔۔؟

اس دوران ایک ہٹا کٹا بندہ پاس سے گزرا اور اُس نے ملا داد خان سرخیلی کو محبت سے سلام کیا۔۔۔تو اُس نے کھڑے ہو کر وعلیکم السلام بھی کی اور محبت سے بولا۔۔۔''آل ویز ویلکم'' دس منٹ بعد میں نے ہٹے کٹے کو پاس سے بھاگتے دیکھا تو سمجھ نہ پایا۔۔۔کیا ماجرا ہے۔۔۔دو خواتین پیچھے سے بھاگتی ہوئی ہانپتی کانپتی آئیں۔۔۔''یہ ہٹا کٹا۔۔۔ہمارا پرس چھین کر بھاگ گیا ہے۔۔۔'' پکڑو۔۔۔اسے۔۔۔وہ چیخیں۔۔۔مگر ہٹا کٹا۔۔۔نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔۔۔پرس میں بیس ہزار روپے اور دو موبائل فون تھے۔۔۔وہ روتے ہوئے بولیں۔۔۔

میں نے ملا خان داد سرخیلی سے کہا۔۔۔خان بھاگ کر اس چور کے بچے کو پکڑو۔۔۔

جانے دو مظفر بھائی۔۔۔یہ ہٹا کٹا روز ہی یہاں سے مجھے ادب سے سلام کر کے گزرتا ہے۔۔۔اخلاق کا بڑا اچھا ہے یہ۔۔۔پھر کبھی گزرے گا تو پکڑلوں گا۔۔۔''ہائیں''۔۔۔کیا رحم لی ہے۔۔۔؟

اس دوران میری نظر ملا خان داد سرخیلی کے بہت پیارے موبائل پر پڑی۔۔۔وہ اُن دو عورتوں کی تسلی کروانے میں مصروف تھا۔۔۔دل چاہا کہ جیب میں ڈال کے نکل جاؤں مگر پھر خیال آیا کہ اس پڑھے لکھے سکیورٹی گارڈ کی نظروں میں میرا امیج خراب ہو جائے گا اور وہ غصے میں لاہور چھوڑ کے کراچی نہ چلا جائے (تیسری بار میٹرک کرنے)۔۔۔ورنہ اس کا موبائل میری دسترس میں تھا۔۔۔اور منہ میں پانی بھی آرہا تھا۔۔۔اُس کا موبائل دیکھ کے۔۔۔

چار پانچ دن بعد میرا وہاں سے دوبارہ گزر ہوا تو وہ مجھے دور سے ہی دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔محبت سے ملا۔۔۔

سر وہ ہٹا کٹا خود ہی کل آ گیا تھا۔۔۔بڑے پیار سے ملا تھا۔۔۔ملا داد خان سرخیلی نے ہنستے ہوئے بتایا۔۔۔میں نے اُس کو بہت ڈانٹا اور ڈرایا بھی۔۔۔وہ چپ رہا۔۔۔شرمندہ تھا۔۔۔میں نے اُس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ایسی غلیظ حرکت کبھی نہیں کرے گا۔۔۔عورتوں سے پرس چھیننا بُری بات ہے۔۔۔ویسے بھی ہمیں عورتوں کا ''احترام'' کرنا چاہئے۔۔۔؟

''اُس کو پولیس کے حوالے کرتے ناں آپ۔۔۔''میں نے کہا تو وہ بولا۔۔۔

مظفر صاحب وہ پھر آ جائے گا۔۔۔اگر باز نہ آیا تو اب کی بار میں اُسے نہیں چھوڑوں گا۔۔۔

میں چلنے لگا تو خان بولا۔۔۔مظفر صاحب سنیں تو۔۔۔''جی جی'' وہ ہٹا کٹا حرام زادہ کل جاتے ہوئے میرا نیا خوبصورت موبائل چرا کے لے گیا جو میں نے قسطوں پر لیا تھا۔۔۔ابھی اُس کی صرف دو قسطیں ادا کی ہیں۔۔۔چالیس قسطیں باقی ہیں۔۔۔؟ ملا داد خان سرخیلی نے پریشانی میں بتایا۔۔۔میری برداشت کی حد ختم ہو گئی۔۔۔ہٹے کٹے بھی یہاں ہیں اور ملا خان داد سرخیلی بھی اِدھر ہی رہیں گے۔۔۔نہ یہ بدلیں گے نہ وہ۔۔۔

میں نے ملا داد خان سرخیلی سے اجازت چاہی۔۔۔اُس نے دودھ پتی منگوا رکھی تھی۔۔۔میں نے کھڑے کھڑے وہ پی۔۔۔اس دوران ہٹا کٹا نئی بغیر نمبر پلیٹ موٹر سائیکل پر گزرا۔۔۔اُس نے رُک کر ملا داد خان سرخیلی کو سلام کیا۔۔۔ملا داد خان سرخیلی نے نہایت ادب سے سلام کا جواب دیا۔۔۔نئی موٹر سائیکل کی مبارک باد دی۔۔۔اُس نے شکریہ ادا کیا تو ملا داد خان سرخیلی محبت سے بولا۔۔۔

''آل ویز ویلکم''۔۔۔ "Always Welcome"

اور میں ''شرمندگی'' سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔۔۔

سلام

امجد اسلام امجد/لاہور

واقعہ کربلا اور جناب امام اوران کے جلیل القدر رفقاء اور اہل خاندان کی شہادت ہم مسلمانوں کا ہی نہیں تاریخ عالم کا بھی ایک ایسا روشن باب ہے جس میں اصول کے مقابلے میں زندگی اور قربانی کے سامنے دنیاوی تحریص کے چناؤ کا ایک ایسا فیصلہ سامنے آتا ہے جو بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی بازگشت تمام عالم اسلام اور اس کی مختلف زبانوں میں لکھے جانے والے ادب میں صاف سنائی دیتی ہے۔ رب کریم کے سوا کسی بھی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا جو سبق ہمیں میدان کربلا اور لب فرات لکھی جانے والی اس عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی داستان میں ملتا ہے اس کو ابن آدم کا ایک اجتماعی ورثہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یزید کے ظلم اور بے انصافی اور جناب حسین علیہ السلام کا زندگی کی قیمت پر اس کی بیعت سے انکار حق کی پاسداری کا ایک ایسا مظہر ہے جو رہتی دنیا تک ایک مینارہ نور کی طرح روشنی کی سمت نمائی کرتا رہے گا۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؑ

اس تاریخ ساز سانحے سے متعلق مرثائی ادب اسلامی دنیا میں لکھے جانے والے ادب کا ایک اہم حصہ ہے کہ ان واقعات اور اس سے متعلق کرداروں پر انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ گزشتہ کچھ دہائیوں سے اس حوالے سے "سلام" کو بطور ایک صنف کے بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور لکھنے والوں نے اس سے کوزے میں دریا کو بند کرنے کا کام لیا ہے کہ چند اشعار میں اتنا کچھ انتہائی عمدہ اور مؤثر انداز میں کہہ دیا جاتا ہے جو روایتی مرثیے میں وسعت کے باوجود تنگئ داماں کا شکار نظر آتا تھا۔ میں نے محض نمونے اور مثال کے طور پر دو سلام انتخاب کیے ہیں دیکھئے کہ ان دونوں کا انداز اور ذخیرہ الفاظ (بہت حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود) اس تصویر میں کیا کیا رنگ بھر رہا ہے۔ پہلا سلام ادیب رائے پوری صاحب کا ہے بدقسمتی سے میں ذاتی طور پر ان کے کلام سے متعارف نہیں ہوں لیکن اس سلام کو پڑھنے کے بعد اب یقیناً ان کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش کروں گا۔ یہ سلام مجھے برادر عزیز عامر بن علی نے بھجوایا ہے جو برسوں سے جاپان میں مقیم ہونے کے باوجود روحانی طور پر اب بھی اپنے آبائی شہر میاں چنوں کے نواح میں ہی رہتا ہے اور خود بھی ایک بہت خوب صورت اور تخلیقی رجحانات رکھنے والا شاعر ہے، ادیب رائے پوری کہتے ہیں:

آیا نہ ہوگا اس طرح رنگ و شباب ریت پر
گلشن فاطمہؑ کے ساتھ سارے گلاب ریت پر
جان بتولؑ کے سوا کوئی نہیں کھلا سکا
قطرہ آب کے بغیر اتنے گلاب، ریت پر
جتنے سوال عشق نے، آل رسولؐ سے کیے
ایک سے بڑھ کے ایک دیا سب نے جواب ریت پر
عشق میں کیا لٹائیے، عشق میں کیا بچائیے
آل نبی نے لکھ دیا سارا نصاب ریت پر
ترے حسینؑ آب کو، جو میں کہوں تو بے ادب
لمس لب حسینؑ کو ترسا ہے آب ریت پر
آل نبیؐ کا کام تھا، آل نبیؐ ہی کر گئے
کوئی نہ لکھ سکا ادیب ایسی کتاب ریت پر

عرفان صدیقی مرحوم بھارت میں زوال پذیر اردو زبان کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنے زور قلم سے اس میں نہ صرف ایک نئی جان پھونک دی بلکہ ایک ایسا معیار بھی قائم کیا کہ انھیں ستر کی دہائی کے بعد سے بھارت میں اُردو کا سب سے زیادہ تخلیقی امکانات کا حامل اور باکمال شاعر کہا جا سکتا ہے جس کی ایک زندہ مثال ان کا کہا ہوا یہ سلام بھی ہے کہ جس میں ایک واقعہ آنے والے تمام زمانوں پر حاوی اور محیط ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

رُکا ہوا ہے یہ صحرا میں قافلہ کیسا
اور ایک شور سا خیموں میں ہے باپ کیسا
اسیر کس نے کیا موج موج پانی کو
کنار آب ہے پہرہ لگا ہوا کیسا
وہ مہربان اجازت تو دے رہا ہے مگر
اب آ گئے ہیں تو مقتل سے لوٹنا کیسا
یہ ایک صف بھی نہیں ہے، وہ ایک لشکر ہے
یہاں تو معرکہ ہوگا، مقابلہ کیسا!
یہ سرخ بوند سی کیا گھل رہی ہے پانی میں
یہ سبز عکس ہے آنکھوں میں پھیلتا کیسا
کھڑا ہے کون اکیلا حصار غربت میں
گھرا ہوا ہے اندھیروں میں آئنہ کیسا

(بشکریہ: ایکسپریس)

کیا ہم سچ میں آزاد ہیں؟

ہبہ زاہد/ایف سی کالج

یہ کیسی آزادی ہے؟ پاکستان کس لیے بنایا گیا؟ تاکہ ہم سب آزاد رہ سکیں۔ تاکہ ہم سب سکون سے اپنی زندگی گزار سکیں تاکہ ہمیں کسی سے کم تر نہ رہنا پڑے، تاکہ کوئی ہم پر حکومت نہ کر سکے۔ تاکہ ہم آزادی میں اپنی زندگی گزاریں۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ مجھے نہیں لگتا۔ شاید کسی کو بھی نہیں لگتا۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ ایک آزاد وطن پانے کے بعد بھی ہم آزاد نہ ہو سکے؟ ہمارا ملک تو آزاد ہو گیا مگر ہم آزاد نہ ہو سکے۔ کیوں؟ کون ہے ذمہ دار؟ شاید اس کی وجہ ہم خود ہیں۔ شاید اس کی وجہ ہمارا معاشرہ ہے۔ شاید اس کی وجہ ہمارے رسم و رواج ہیں۔ جن کی وجہ سے کوئی برابر نہیں رہا۔ جن کی وجہ سے ہم سب میں فاصلے ہیں۔ جن کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتا اور ہم ایک نہیں رہے۔ دولت کے نام پر لکیریں پیدا ہو گئی ہیں۔ جو امیر ہے اس کے لیے سب حلال ہے۔ سب جائز ہے اور غریب کے لیے سب حرام ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ حلال اور حرام کا فیصلہ بھی دولت ہی کرتی ہے۔ جس وطن میں لوگوں کے طبقات کا فیصلہ بھی دولت کے ہاتھ میں ہے اس وطن میں لوگوں کے ہاتھ میں کیا ہوگا؟ جس وطن میں لوگ ایک نہ ہو سکیں، اس وطن کو کیسے آزادی ملے گی؟ اس وطن میں رہنے والے لوگوں کو کیسے رہائی ملے گی؟

ہمارے آباؤ اجداد ہمارے لبوں پر تالے لگا کر چابیاں کہیں گہرائی میں دبا گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے بولنے تک کے لیے تو آزاد نہیں ہیں ہم! ہمارے اس ملک میں دولت کے آگے اور کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خون کا کوئی مول نہیں ہے۔ جان کی کوئی قیمت نہیں ہے:

کوئی چھوٹا کسی کے سامنے کچھ بولتا ہے تو سب اسے چپ کروا دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ چاہے وہ صحیح بات ہی کیوں نہ بول رہا ہو، پھر بھی اس کو کیوں چپ کروا دیا جاتا ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ عمر میں چھوٹا ہے؟ تو کسی کے سامنے کچھ بولنے کا اس کا کوئی حق نہیں ہے؟ ہمارے معاشرے میں باپ کے سامنے بیٹی کچھ کیوں نہیں بول سکتی؟ وہ کچھ بولتی ہے تو لوگ اس کے لبوں پر لڑکی ہونے کی وجہ سے شرم و حیا کا تالہ لگا دیتے ہیں۔ اُسے چپ کروا دیا جاتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ ایک عورت ہے۔ عورت ہونے کی وجہ سے اس کو کچھ بولنے کا حق نہیں ہے۔ یہ سب صرف ہمارے لیے معاشرے کا کیا دھرا ہے۔ اس میں ہمارے والدین کی غلطی نہیں۔ ہمارے معاشرے کی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ لوگوں کے ڈر سے بچوں کی زبانیں بند کر دی گئی ہیں۔

آزاد وطن پانے کے بعد بھی ہم آزاد نہیں ہیں۔ بچے سکول جانے سے ڈرتے ہیں۔ 6 ستمبر 2014 کو پشاور میں جو واقعہ پیش آیا وہ ہمیں کس چیز سے آگاہ کرتا ہے؟ کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ سورج ڈھلنے کے بعد اکیلی لڑکی گھر سے کیوں نہیں باہر نکل سکتی؟ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں اس بات سے آگاہ کرتی ہیں کہ ہم ابھی بھی قید ہیں۔ ہمارا ملک صرف نام کا آزاد ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب کے راستے پر چل رہے ہوتے تو ہم آزاد ہوتے۔ ہر لحاظ سے ہم برابر ہوتے۔ کوئی مقابلہ نہ ہوتا، بہت سادہ اور پرسکون زندگی ہوتی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا خیال رکھتا۔ کوئی کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرتا۔ ہر کوئی امن میں ہوتا۔ ہر کوئی برابر ہوتا۔ کوئی کسی پر حکومت نہ کرتا۔ ہم سب آزاد ہوتے۔

کاش! کہ ہم سب صرف مسلمان ہوتے۔ کوئی سنی، کوئی شیعہ نہ ہوتا۔ صرف مسلمان ہوتے! آزاد مسلمان! آزاد پاکستان میں آزاد مسلمان! اس سب کی ذمہ داری ہماری چھوٹی سوچ ہے۔ ہماری سوچ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ مگر کب تک ہم قید رہیں گے؟ کب تک ہم خاموشی سے ظلم سہتے رہیں گے؟ ہم سب کو آواز اُٹھانی ہوگی۔ ناانصافی، ظلمت کے خلاف بولنا ہوگا۔ پھر چاہے کیسا بھی ظلم کیوں نہ ہو، چاہے وہ گھر میں بیٹی کے ساتھ ہو یا معاشرے میں لوگوں کے ساتھ۔ ایسے آزاد وطن کا کیا فائدہ جب اس میں رہنے والے ہی آزاد نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو قید کر لیا ہے۔ ہم آزاد نہیں ہیں۔ ہمیں آزاد ہونا پڑے گا۔ اپنے مستقبل کے لیے۔

فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا ہے؟

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!
بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے

کیا دیا ہم نے اپنے وطن کو؟ ہم اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ہمیں یہ وطن دیا جائے۔ اس سرزمین کے قابل نہیں ہیں۔ ہم ایک الگ وطن کے لحاظ سے ہم آزاد ہیں۔ مگر ہم نے ایک آزاد وطن ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو اپنی باتوں کے جال میں قید کرلیا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے گرجا گھر والا واقعہ کیا ظاہر کرتا ہے؟ کیا ہوا ہے یہ؟ لوگوں کو آگ لگا دی؟ کسی بھی مذہب سے پہلے انسانیت آتی ہے۔ یہ انسانیت ہے؟ ہم میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیا اتنی ہی انسانیت رہ گئی ہے ہمارے اندر؟ صادق اور امین ہونا ضروری ہے۔

ہمارا مذہب کیا کہتا ہے؟ ہمارا مذہب کس چیز کے بارے میں بات کرتا ہے؟ مساوات کے بارے میں، برابری کے بارے میں، امن کے بارے میں، انسانیت کے بارے میں! اسلام میں پہلے اللہ کی عبادت کے بعد انسانیت کا درجہ ہے۔ کسی انسان کا احساس کرنا ایک انسان کی نشانی ہے۔ کوئی حکمران چاہے وہ نواز شریف ہو، عمران ہو، آصف علی زرداری ہو یا جو بھی ہو ہمارے ملک کے حالات بہتر نہیں کرسکتا۔ ان مشکل وقتوں کو ختم نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ ہم خود اپنے آپ کو تبدیل نہ کرلیں۔ جب تک ہم اپنے اندر کے مردہ ضمیر کو واپس زندہ نہ کرلیں ہم کسی بھی لحاظ سے آزاد نہیں ہیں۔ عورت کو دیکھا جائے تو وہ بھی آزاد نہیں ہے۔ عورت اپنی زندگی کیوں نہیں جی سکتی؟ پہلے اس کو ماں باپ کی مرضی سے زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ پھر اس کو ایک بہن بن کے۔ پھر اس کو ایک بیوی بن کے شوہر کی مرضی سے اور ساس کی مرضی سے، پھر ماں بن کر وہ اپنے لیے کب جیے؟ جب وہ بوڑھی ہو جائے؟ ہمارا معاشرہ ایک عورت کو جینے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ عورت مختلف رشتوں کی زنجیروں میں بندھی رہ جاتی ہے۔ وہ زنجیریں کھل کیوں نہیں سکتیں؟ صرف عورت ہی قربانی کیوں دے؟ عورت سے ہی کیوں قربانی مانگی جاتی ہے؟ پھر میں، بہو کے روپ میں یا بیوی کے روپ میں۔

ہر بار عورت ہی کیوں؟ بار بار عورت ہی کیوں؟ ماں کے پیروں تلے جنت ہے۔ ماں عورت ہے کوئی آزاد نہیں ہے۔ کوئی بھی آزاد نہیں ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اگر تو ہم آزاد ہیں تو کس لحاظ سے؟ ایسی کون سی زنجیر ہے جو ہم نے توڑ دی ہے؟ ایسا کون سا تالا ہے جو ہم نے کھول دیا ہے؟ ہمارا وطن سب سے بہت پیار کرتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ زمین کہتی ہے کہ نہ میں اس کی ہوں، نہ میں اُس کی ہوں، بلکہ یہ دونوں میرے ہیں۔ جب ہم نے اپنے وطن کو کوئی خوشی، کوئی سکون، کوئی ایمانداری نہیں دی، پھر ہم ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ہمارے وطن نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ پھر ہم اپنے ملک سے کیوں اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں؟ ہم نے خود کیا دیا اپنے وطن کو؟

آج ہم جو قید ہیں، اس کی وجہ ہمارا ملک نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ ہمیں یہ کہنے کے بجائے کہ پاکستان ایسا ہے، ویسا ہے، اس وطن نے کچھ نہیں کیا، نہ کچھ کرسکتا ہے۔ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ہم نے اپنے وطن کے ساتھ ناانصافی کی ہے، ہم اپنے وطن کے قرض نہیں چکا سکے۔ جو قرض ہمارا ہمارے وطن پر ہے ہم اس وطن کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم خود اپنے ملک کو برا کہتے رہیں گے تب تک ہم آزاد نہیں ہو پائیں گے۔ ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں اپنے اندر اچھائیاں پیدا کرنی ہوں گی۔

تاکہ ہم خود اچھے بنیں اور پھر اس وطن میں اچھائی پھیلائیں۔ نفرت کی دیوار گرادیں۔ فرق کی بیڑیاں کھول دیں۔ لبوں کے تالے کھول دیں۔ پھر سے ایک ہو جائیں، پھر سے آزاد ہو جائیں۔ جنھوں نے وطن بنایا ان کو خوشی دیں اور بتائیں کہ ہمیں اپنے وطن کا احساس ہے۔ انھوں نے ہمیں آزاد کرایا تو انھیں بتائیں کہ ہاں! ہم آزاد ہیں، ہر لحاظ سے آؤ! ہر فرق مٹادیں۔ اپنے آنے والے بچوں کی خاطر کہ کہیں وہ بھی اس سب کا شکار نہ ہو جائیں۔ کہیں یہ ننھے بچے بھی اس کرپشن کا شکار نہ ہو جائیں۔ کہیں کھو نہ جائیں، یہ تارے زمین پر۔ آؤ قدم سے قدم ملائیں آؤ مل کر ساتھ چلیں کہ یہ وطن ہمارا ہے۔ ہم ہیں پاسباں اس کے!

متفرق شاعری

بات بات پہ کیوں اترائیں
اپنی زد میں خود کیوں آئیں
غفلت سے غافل ہو جائیں
وقت کی آنکھیں کھولتے جائیں
کچھ کرنے سے کیوں گھبرائیں
بات بگاڑیں بات بنائیں
جہت جہت میں پھیلتے جائیں
ہم اپنی وسعت دکھلائیں
اوروں ہی کے رنگ نہ دیکھیں
کچھ اپنے بھی رنگ دکھائیں
ایک ہی وقت میں سارے تجربے
جیتے جائیں مرتے جائیں
سنجیدہ سنجیدہ رہ کر
کوئی قلابازی بھی لگائیں
آپ کی ہمت یاؔد بڑھے گی
اوروں کی ہمت بھی بڑھائیں

سیّد مشکور حسین یاؔد/لاہور

رابطہ ہے ابھی ہواؤں سے
جی رہا ہوں تری دعاؤں سے
زندگی! بول کیا ارادہ ہے
موت مہنگی نہیں دواؤں سے
تو مری لغزشوں پہ طنز نہ کر
میری پہچان ہے خطاؤں سے
اس کو کہتے ہیں ہم زمیں کی کشش
لوٹ آیا بشر خلاؤں سے
اے خدا! اب تو بال و پر دے دے
جسم چھپتے نہیں قباؤں سے
جرم بھی بے حساب کرتے ہیں
بچ بھی جاتے ہیں وہ سزاؤں سے
رنج و غم ہوں کہ حسرت و ارماں
مطمئن ہوں تری عطاؤں سے
جتنے خانہ خراب ہیں سب کو
بددعائیں ملی ہیں ماؤں سے
کوششیں چھوڑ دوں بھی نصرت
کام نکلیں اگر دعاؤں سے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

دیکھا جو میں نے پھاند کے دیوار ہست و بود
پیش نظر تھے پھر وہی آثار ہست و بود
ہر چند رخشِ عمر کو مہمیز بھی کیا
کم ہو سکی نہ بڑھ سکی رفتار ہست و بود
جب رزق ہو چکے ہیں مرے خاکداں کا آپ
اب وضع کیجیے کوئی معیار ہست و بود
اک عمر سے ہوں راحتِ فردا کا ہم قدم
اس بار سر پہ آ پڑا ادبار ہست و بود
اُس نے کنارہ کر لیا تقویم ذات سے
لکھ کر مرے نصیب میں اشار ہست و بود
آزاد ہو نہ پاؤں گا میں اپنی قید سے
میں کر سکوں گا کیا کبھی انکار ہست و بود
خوش ہے نہ خوش رہے گا یہاں کوئی مشتری
روز ازل سے تیز ہے بازار ہست و بود
کل کو کسی طرح مری دنیا بدل بھی جائے
پھر بھی بدل نہ پائیں گے اطوار ہست و بود
ساجد کسی سے کوئی شکایت نہیں کہ اب
ہے ناخدا کے ہاتھ میں پتوار ہست و بود

غلام حسین ساجد/لاہور

خوشبوئے موسم گل و گلزار اک طرف
اُن گیسوؤں کی عنبریں مہکار اک طرف
جتنے ملے ہیں زیست میں آزار اک طرف
اور اُس کی اک نگاہ ضیا بار اک طرف
لطف و کرم کا باغ ارم ہے قرار جاں
جور و جفا کی وادیٔ پُرخار اک طرف
ہر چند لاجواب ہیں آنکھیں سبھی یہاں
اُس خوش نظر کی چشم فسوں کار اک طرف
لرزش ہی ان لبوں کی ہے غارت گر حواس
نظروں کا تیر، عشووں کی تلوار اک طرف
سب آستاں ہیں اپنی جگہ رشک مہر و ماہ
لیکن جمال و حسنِ در یار اک طرف
بوسہ یہ سنگ در کا ترے ہے کمال عجز
برسوں کا زعم اور مرا پندار اک طرف
پہلے نہیں کہی تھی تو میں کہتا ہوں اب یہ بات
سب لوگ اک طرف ہیں مرا پیار اک طرف
کاغذ پہ ان سے نامہ و پیغام جو بھی تھا
قاتل لبوں سے پیار کا اظہار اک طرف
دل میں تری وفا ہے تو کچھ اور کیا سمائے
''گنجائش عداوت اغیار اک طرف''

شاعری (غزل، نظم)

جو کچھ عطا ہوا ہے مجھے وہ بھی کم نہیں
جو کچھ ہے میری ذات کو درکار اک طرف
منزل کی جب لگن ہے تو رُکنا نہیں کہیں
راشدؔ مسائل رہ دشوار اک طرف

محمد ممتاز راشد لاہوری

معجزے مردوں کو زندہ نہیں کرنے والے
سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں مرنے والے
آدمی آدمی کی جان کا دشمن ہے سو اب
اس درندے سے پرندے نہیں ڈرنے والے
بعد از مرگ بھی واویلا ہی واویلا ہے
زندگی میں بھی نہیں زخم یہ بھرنے والے
چھو کے آئے ہیں ابھی یار کی دہلیز کو ہم
اس لیے پاؤں زمیں پر نہیں دھرنے والے
تجھ کو نظروں سے گراتے ہوئے یہ سوچتا ہوں
سر پہ چڑھ جاتے ہیں کیوں دل سے اُترنے والے
وعدۂ وصل کی اُمید کے بر آنے تک
ہم ترے ہجر سے ہجرت نہیں کرنے والے
جان کی بازی تو اس جنگ میں ہر سکتے ہیں
ہم مگر عشق کی بازی نہیں ہرنے والے

مسعود احمد/اوکاڑہ

مجھ کو کہانیاں نہ سنا شہر کو بچا
باتوں سے میرا دل نہ لبھا شہر کو بچا
تو اس لیے ہے شہر کا حاکم کہ شہر ہے
اس کی بقا میں تیری بقا شہر کو بچا
میرے تحفظات تحفظ سے ہیں جڑے
میرے تحفظات مٹا شہر کو بچا
تو جاگ جائے گا تو سبھی جاگ جائیں گے
اے شہر یار جاگ ذرا شہر کو بچا
بھڑکا رہی ہے آگ کو خود تیل ڈال کر
کہہ بھی رہی ہے خلق خدا شہر کو بچا
کوئی نہیں بچانے کو آگے بڑھا حضور
ہر اک نے دوسرے سے کہا شہر کو بچا
تاریخ دان لکھے گا تیمورؔ یہ ضرور
اک شخص تھا جو کہتا رہا شہر کو بچا

ڈاکٹر تیمور حسن تیمور/لاہور

جب بھی ہوائے شہر کو ناساز دیکھنا
میرے پرندِ فکر کی پرواز دیکھنا
ہر گام یادگار بنا کر چلیں گے ہم
شوقِ جنونِ عشق کا آغاز دیکھنا
تو نے مری نظر کی کرامت تو دیکھ لی
اب تم ہمارے نطق کا اعجاز دیکھنا
یہ بھی نئے دنوں کا اک پیغام تو سمجھ
اُڑتا ہوا فضا میں جو شہباز دیکھنا
کچھ ایسے دب سکے گا نہ لہجہ ندیمؔ کا
ہر گھر میں ہوگی اُس کی ہی آواز دیکھنا
خاموش ہے ندیمؔ تو کچھ سوچ کر اے دوست
مقتل میں لب کشائی کا انداز دیکھنا

ریاض ندیم نیازی/سبی

تمہارے ذہن سے، ادراک سے اُترتے ہوئے
میں ٹوٹ جاؤں گا افلاک سے اُترتے ہوئے
جو میری شکل تھی تو نے وہی بنائی نہیں
بکھر رہا ہوں تبھی چاک سے اُترتے ہوئے
سحر ہوئی تو دیا طاق میں لرزنے لگا
دعا بھی بجھنے لگی طاق سے اُترتے ہوئے
بتا رہا ہے کہ اب قحط آنے والا ہے
سنہری رنگ مری خاک سے اُترتے ہوئے
شہیدِ عشق کا ہے خون اے مرے قاتل!
پکار اُٹھے گا پوشاک سے اُترتے ہوئے

ہدایت کاشف/آدم والی

جو درمیاں ہے رکاوٹ ہٹا کے دیکھ مجھے
سنوار زیست گلے سے لگا کے دیکھ مجھے
تھکن سے چور بدن کا غبار ہلکا ہو
پھر ایک بار برابر بٹھا کے دیکھ مجھے
طلسمِ خواب میں سویا ہوں اک زمانے سے
اب اپنی نیند میں لا کر جگا کے دیکھ مجھے
بہت ہی خاص ہوں دنیا کے کارخانے میں
اس آسماں سے زمیں سے چھپا کے دیکھ مجھے
محبتوں میں کوئی فاصلہ روا ہی نہیں
یہ پردے غیر ضروری ہٹا کے دیکھ مجھے
جھکا رہا ہے مجھے کس اصول کی رو سے
بہت بلند ہوں ایڑی اٹھا کے دیکھ مجھے
یہ میرا عشق سرایت نہ تجھ میں کر جائے
میں آفتاب ہوں نظریں جھکا کے دیکھ مجھے

آفتاب خان/لاہور

شاعری (غزل، نظم)

مجھے اس تیرگی میں تم دیا دو روشنی ہو
مرے مرشد کوئی ایسی دعا دو روشنی ہو
تجھے یہ ہجر کی تیرہ شبی تو مار دے گی
مری تصویر کمرے میں لگا دو روشنی ہو
شبِ ہجراں وظیفہ کر رہا ہوں تیرے غم کا
چلو تم بھی کوئی قصہ سنا دو روشنی ہو
تمہیں ڈر ہے سفینہ ڈوبنے کا ناخداؤ
تو دریا میں مرے آنسو گرا دو روشنی ہو
چراغاں ہو غریبِ شہر کی مرقد پہ بھی تو
امیرِ شہر کے گنبد جلا دو روشنی ہو
زمیں آنکھوں کی بنجر ہو چکی ہے یاخدایا
مجھے محبوب کا کُرتا دکھا دو روشنی ہو

آغر ندیم سحر/منڈی بہاؤالدین

اہلِ وطن کے نام

تم ہمیشہ جھوٹ کو سچ سے جدا کرتے رہو
جو تمہارا فرض ہے، اُس کو ادا کرتے رہو
دیس کی مٹی تو ماں ہوتی ہے اربابِ چمن
اس لیے تم اپنی مٹی سے وفا کرتے رہو
ایک ہو جائیں علاقائی تعصب چھوڑ کر
تم یہی اہلِ وطن سے استدعا کرتے رہو
یاالٰہی خیر ہو اس ملک پاکستان کی
بارگاہِ کبریا میں یہ دعا کرتے رہو
پیار کرنا، گر وطن سے، جرم ہے تو دوستو
جرم ایسا خوبصورت بارہا کرتے رہو
جاگتے رہنا ہی کہنا فرض چوکیدار کا
گو فقیر بے نوا ہو، پر صدا کرتے رہو
سوچ کے دریا میں ٹھہریں موجزن جذبات جو
اے قمر اظہار اُن کا برملا کرتے رہو

قمر حجازی/اوکاڑا

لوگ پھرتے ہیں دربدر کیسے
تیرا در ہے تو اور در کیسے
جو بدل جائیں موسموں کی طرح
ایسوں کو جانوں معتبر کیسے
پھر مقدر نے یاوری کی ہے
دیکھ روشن ہے میرا گھر کیسے
رنگ بخشتے ہیں چھو کے پھولوں کو
اس کے ہاتھوں میں ہیں ہنر کیسے
رسمِ شہرِ ستم گراں ہے یہی
سچ کے تن پر رہے گا سر کیسے
تجھ کو چاہا تو پھر نہیں سوچا
عیب کیا کیا ہیں اور ہنر کیسے
اب ستارہ نہ کوئی جگنو ہے
لوگ کاٹیں گے اب سفر کیسے
جانے والے تو جا چکے امجد
تجھ کو جانا ہے اپنے گھر کیسے

شکیل امجد صادق

میں محبت کا سمندر دیکھتا ہوں
تجھ کو اپنے دل کے اندر دیکھتا ہوں
اُس کی آنکھوں سے چھلکتا ہے بہت کچھ
پانیوں میں ڈوبتا گھر دیکھتا ہوں
ہر کسی کی "لوٹ ماری" سے محبت
ہاں مگر کچھ لوگ بہتر دیکھتا ہوں
جب نظر میری ہٹے تو ہٹ ہی جائے
دیکھتا ہوں تو برابر دیکھتا ہوں
بات ہوتی ہے ہمارے گھر کے اندر
اور ساگر شور باہر دیکھتا ہوں

صدام ساگر انصاری/گوجرانوالہ

روز کہیں سے آ جاتا ہے
دل کے زخم دُکھا جاتا ہے
اپنا کام ہے تکتے رہنا
اس میں اس کا کیا جاتا ہے
دیکھ کے ترچھی نظروں سے وہ
پھر مجھ سے شرما جاتا ہے
کبھی کبھی تو ہنس ہنس کر وہ
دل میں دیپ جلا جاتا ہے
جاتا ہے جب ہلکی ہلکی
من میں آگ لگا جاتا ہے
دل سے بالم پھول کی مانند
پھول آخر مرجھا جاتا ہے

اقبال بالم/بھکر

انا کے جزیرے سے باہر نکل
تو چاہے جو عزت تو خود کو بدل
یہ اترانا خود پر ہے کس بات کا
ذرا ہوش کر تو اے ناداں سنبھل

شاعری (غزل، نظم)

ہے کیوں ہر گھڑی فکر اپنی تجھے
کبھی غیر کے واسطے بھی مچل
محبت سے سب کو تو اپنا بنا
کسی کی محبت سے ہرگز نہ جل
بڑھا اپنی ہمت کمر باندھ لے
نہ تنہائی میں بیٹھ کر ہاتھ مَل
جلاتا ہوں شب بھر میں اپنا لہو
تبھی جا کے ہوتی ہے میری غزل

رئیس راج / ملتان

گلزار چمن زار کبھی خوب رہا دل
ویران، بیابان ہے اب دشت مرا دل
ارمان کی بستی جو تہہ خاک ہوئی ہے
دراصل سبب اس کی تباہی کا بنا دل
اب مجھ کو چراغوں کی ضرورت ہی نہیں ہے
جلنے کو مرے سنگ رہے گا جو مرا دل
جب رات اُجالوں کی طلب کرنے لگی تو
تب رات کی ظلمت میں مرا ہی تو جلا دل
شدت جو غم دل کی ذرا حد سے بڑھی تو
جذبات میں نینوں سے لہو بن کے بہا دل
کس بات کا ہے مان تجھے دل پہ مدثر
کب ساتھ ترے ایک قدم بھی ہے چلا دل

مدثر شمن

جیکو رکو واپسی

(۱)

میں
خوابوں کے خاکستری گھوڑے پہ
ان پہاڑوں پہ گھوما
اُڑا
پھیلتے خطوں کی سمت
خوانچہ فروشوں سے بھرے شہر کے
مین بازار کی سمت لپکا
تھکی ماندی شامیں
مچاتی ہوئی شور راتیں
خموشی سے لبریز راہیں
اُداسی بھری روشنی دیکھی
انگور کے سبز، شاداب باغوں کو
خوش رنگ پھولوں میں ملفوف خوشبو کو
دیکھا ہے
اور
موت، دریا کے خوابیدہ رہتے کناروں پہ
چلتے ہوئے میں نے دیکھی ہے
اے کاش!
پاکیزہ لڑکی
وہ دریا کا پانی پیے
یہ لہو رنگ سورج
کناروں کے مابین خود کو ڈبوئے
یا اُوپر اُٹھائے
اگر
رات کی شامیں
پتے میں ڈھل جائیں
اور
قحبہ خانوں کے دروازے
ان گاہکوں پر
اگر بند ہو جائیں

(۲)

سر سبز مشرق کے سورج کے نیچے
میں
خوابوں کے خاکستری گھوڑے پر
اپنے جیکور کی شان و شوکت سے لبریز
فیاض گرما میں
پھول، اوس اور پانیوں سے گزرتا
مڑا
ستارے کا (روشن) اُفق
آسماں کے تلے
روح کا جنم استھان!
چشمے کو ڈھونڈوں
تھکے ماندے راہی کی
بڑھتی ہوئی پیاس بجھ پائے

(۳)

جیکور
روٹی کا ٹکڑا کہاں ہے
کہاں پہ ہے اک گھونٹ پانی
وہاں
رات کیا چھا گئی ہے
سبھی گارڈ کیا سو گئے ہیں
تھکے ماندے، بے خواب، بھوکے

مسافر بھٹکتے ہیں
آ کر ہوا بین کرتی
اُفق بھرتی جاتی ہے
اک
لمبا صحرا ہے
ناپید رستے ہیں
اور رات کے اندھے افلاک میں
باہوں کو پھیلا
ہمیں اندر آنے دے
ہم بھی ستاروں کو دیکھیں
کبھی رقص کرتے ہوئے!

(۴)

کس نے نظمیں مری سُنی ہیں
مرے گھر، میرے آبائی گھر میں
کوئی موت کی سی اُداسی ہے
پوری کا آگاہ ہے
اس
سراسیمہ ہوتی ہوئی رات میں
کون
میری صلیبیں اُٹھائے گا
آواز دے گا
بھوکے کو کھانا کھلائے گا
مفلس کو پوچھے گا
مصلوب عیسیٰ کو
نیچے اُتارے گا
اور
صبح سے
یہ اندھیرے کا کالا پونچھ
اُٹھائے گا
کانٹوں کو پھینکے گا
اور پھول لائے گا
جیکور
سنتے ہو
کیا تم وہاں ہو
فقط ایک ہی روح (خواہ بانجھ ہو)
سامنے لاؤ
تا کہ
مسافر ستارے کو دیکھیں
ذرا رات روشن کریں
وہ مسافر کہ جن کے لیے
کوئی رستہ
کوئی خواب تک بھی نہیں!

(۵)

موت کی آرزو ہے
مگر موت آتی نہیں ہے
کوئی خطبہ؟
کہیں پر صدا تک نہیں
کچھ بھی نہیں
میرے بغداد میں
کس نے
شاعر کو پھانسی پہ لٹکایا
نظموں کی بولی لگائی
بھلا کون..........
اُس کی آنکھوں کی تکریم کرتا ہے
پھولوں کے بدلے
اُسے کون
کانٹوں بھرے تاج پہناتا ہے
میرے جیکور
زرتار دھاگوں نے
اس صبح کے واسطے
کیسے
جھولا
جھلایا
پرندوں کو، کیڑوں کو
آواز دو
وہ مرے زخم پر آ کے بیٹھیں
ضیافت کا آغاز کر دیں
زمانہ تعاقب میں ہے
غبار کے اس دہانے کو
مکڑی نے
جالے سے ڈھک سا دیا ہے
میں مرنے لگا ہوں یہاں
اور
روشنی
دشت کے جال میں
ان کھجوروں کے گھیرے، گھنے شاخچوں کے
جھرو کے سے
کسی
لالچی وقت کو پالنے میں مگن ہے
مرے دل میں بہتا ہے
جیکور
وہ پانی اور سرکہ
اندر ہی اندر کہیں میرے ناسور میں
میرے معصوم لوگو

اے جیکور
کیا سن رہے ہو
مرے فاتحوں کے لیے کھول دو
سارے در
چوک میں جمع کر کے
بتاؤ
یہ سالوں کی فصلیں اُٹھانے کا موسم
پانی، مئے اگلیں
مرجاں
سارے خوراک سے ہیں بھرے
یہ محبت کی بیماری کی رُت ہے
(۷)

جیکور
ماضی پلٹ آیا ہے
صبح کا وقت ہے

اور
مرغوں کی آواز ہے
قلم بے خوابی کی اُڑ چکی
لوٹ آیا ہوں آخر
بڑی رات کے میں سفر سے
اے سورج!
اے گندم کے خوشوں کی ماں
ان عمارات کے پیچھے
یہ روٹی کا ٹکڑا
تو موتی سے افضل ہے
ہیروں سے ارفع ہے
میری محبت!
یہ ہنگامہ خیزی بھری بات
سنتی ہو
عبداللطیف اس کو سنتا ہے
وہ جانتا ہے
کہ یہ کیسی تشویش ہے!
جب مری روح کھینچی گئی

اور
گاڑی چیخی تھی

تب
مری اشکوں سے لبریز آنکھیں تھیں
اوپر اُٹھائے لیے جا رہا تھا
مجھے ابر
سیٹی بجی
گاڑی آہستہ آہستہ پٹڑی پہ رینگی
اے میرے دِنوں کے چمک دار سورج
جیکور
مرے اندھیرے کے سالوں میں سویا پڑا ہے!!

بدر شاکر السیاب/عراق

ترجمہ: اقتدار جاوید/لاہور

بستی

کھلی آنکھوں سے دنیا کا تماشہ دیکھتے رہنا
زباں سے کچھ نہیں کہنا
طوافِ رائیگاں کی عادتیں بھی اب پرانی ہیں
یقیں آثار گھڑیاں بھی تصرف میں نہیں میرے
انہی آنکھوں کے اک گوشے میں ست رنگے،
سنہرے خواب رکھے ہیں
کہیں آدھی رفاقت کی کسک نے گھر بنایا ہے
کہیں تکمیل کی خواہش
کسی سنگِ گراں کے عکس کی صورت مجھے
بے چین رکھتی ہے
کہیں رنج والم کے زرد لمحے کسمسا کر بیٹھ رہتے ہیں
یہاں خونبار منظر بھی کئی برسوں سے ٹھہرے ہیں
یہ آنکھیں ہیں کہ کوئی خانماں برباد بستی ہے
میں اب ان کی حفاظت کر نہیں سکتی
سو میں نے اپنی آنکھیں آج نیلامی میں رکھ دی ہیں

حجاب عباسی

میری زندگی کی کہانی

جہاں سرکش دریاؤں کے دو پاٹ
ملتے ہیں اور بچھڑتے ہیں
دریاؤں کے میل
کبھی بچھڑے ہوئے
کبھی سوئے ہوئے
کھیلیں ایسے کھیل
کبھی سنگم کے کھیل
کبھی بچھڑوں کے میلے
دریاؤں کی دین
کسی کھاڑی کا وجود
جہاں جسموں کی آبرو رکھتے دریا
لوگ گزارتے ہیں
اور کبھی دو بے کنارے کی تمنا میں
لوگ پکارتے ہیں
میں مدتوں اس سرکش سنگم و نکھار رہتا ہوں

گویا اسی کے سنگ بہتا رہتا ہوں
مجھے ان کی شوخی عجیب نہیں لگتی
کوئی ان کے بہنے کی
ترتیب نہیں لگتی
ہاں مجھے لگتا ہے
یہ جوان کی روانی ہے
یہ میری ہی زندگی کی کہانی ہے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

مری کی مال روڈ

مری کی مال روڈ پر
ریڈاونین کے سامنے پختہ تھڑی پر
میں اکثر آپ کو بیٹھا مل سکتا ہوں
میری شکستہ عمر کا ڈھیر وہیں ہوتا ہے
میرے خیال رنگین پیراہن اوڑھے
زندگی سے لدے پھندے چہروں کے ساتھ اُڑ جاتے ہیں
تتلیوں کی مانند گھر نہ آنے کے لیے
ایک دوجے کے سنگ ہاتھ تھامے ہوؤں کے ساتھ
ایک دوجے کا سہارا لیے جھکے ہوئے شانوں کے ساتھ
میں تتلی کا روپ لیے بادِ صبا کا بہروپ لیے
ہمیشہ انہی کے سنگ اُڑتا رہنا چاہتا ہوں
تتلیوں کی مانند گھر نہ آنے کے لیے
لیکن اکثر یہ شوق مجھے حیران کرتا ہے
جب کوئی تعلق بوجھ ہوتا ہے
اور میرے دل کو ویران کرتا ہے
چہروں کی شادابی، دلوں کی ویرانی
مجھے میرے جسم کی کشش ثقل سے پرے جانے نہیں دیتی
میں شکستہ عمر کے ڈھیر میں واپس آ جاتا ہوں
مری کی مال روڈ پر
ریڈاونین کے سامنے پختہ تھڑی پر
بیٹھے بیٹھے نا چاہتے میری نظر مل جاتی ہے
ایک پاؤں سے ایڑھ لگاتے ننھے نوجوانوں سے
جو اپنی ریڑھیوں پر جتتے ہیں
جو وقت سے پہلے بڑے ہوتے ہیں
جو رنگین پیراہن پہنے کبھی کہیں نہیں جاتے
جو کسی تتلی کی مانند گھر نہیں چھوڑتے
یہ گھروں کی روحیں ہیں
کسی کا دل نہیں توڑتے
شانے نہیں ڈھونڈتے
منہ نہیں موڑتے
میری عمر کا شکستہ ڈھیر میرے جسم کی صورت میں
کبھی اس تھڑی سے اُٹھنا نہیں چاہتا
میں اب ان محنت کشوں کی طرح
کہیں جانا نہیں چاہتا
میں روح بن کر تتلی کی مانند
اُن کے سنگ چلنا نہیں چاہتا
کیونکہ مجھے ڈر ہے
یہ سچی ہنسی مجھے راس آئے گی
ان کے سچے جذبے مجھے جکڑ لیں گے
میری روح کی تتلی کو میرے شکستہ جسم
میں نہیں آنے دیں گے
میرے پاؤں پکڑ لیں گے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

شکار

جو ایک پھول سے اُڑیں
تو دوسرے پہ جا بیٹھیں
ان رنگ برنگ شوخ تتلیوں میں گھرے
کبھی تم نے سوچا کہ
محبت کا یہ رنگ عارضی اور کچا ہے
تتلی کا پیار کتنا سچا ہے؟؟

شازیہ محسن/خانیوال

ماہنامہ ادب لطیف کا نیا شمارہ شائع ہو گیا
ماہنامہ ادب لطیف لاہور کا خاص شمارہ شائع ہو گیا ہے
یہ ادبی جریدہ 1935 سے تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے
جس کا اجرا چودھری برکت علی نے کیا تھا
اب ان کی صاحبزادی صدیقہ بیگم اور
صاحبزادے محمد خالد چودھری بابائے اُردو بازار
ماہنامہ کا ذیلی دفتر
چودھری اکیڈمی الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 0300-4112009

اپنے پیچھے دوڑتے سایوں کو سمجھانا پڑا
تھا اکیلا ہی مجھے جانا جدھر جانا پڑا
سوچ کی مہلت ملی لیکن ہوا پھر بھی وہی
دل کے جو نزدیک تر تھا اُس کو ٹھکرانا پڑا
اک ہوا لے جا چکی تھی سب صدائیں شہر سے
ڈھونڈنے والوں کو خالی ہاتھ لوٹ آنا پڑا
بے صدا گلیوں کی ہیبت ڈھونڈنے آئی مجھے
پھر مجھے ایسے لگا جیسے مجھے جانا پڑا
وسعت دشت ہوا تھی، ایک میں تھا ایک وہ
خامشی ایسی کہ ہر اک حرف دہرانا پڑا
آخری پتہ خزاں کا شب کی بارش لے گئی
نقش دیوار ہوائے فرنگ تھا جانا پڑا
اک غزل میں نے سنائی تھی مگر پاداش میں
بزم میں سننے مجھے ہر اک کا افسانہ جانا پڑا

جمشید مسرور/ناروے

آج جو میں پاتال سے باہر
اُس رسی کو تھام کے نکلا
جس کے پھندے دار سرے پر
یہ دنیا ایک گیندی کی صورت
لٹک رہی تھی
کوئی نہیں تھا مرنے والا، جینے والا
ہر جانب بس میں ہی میں تھا
کرنوں کے پردے کو ہٹا کر
میں نے دیکھا......وقت کا چہرہ
اُس کی آنکھیں......ایک سمندر
جس کے اندر کچھ بھی نہیں تھا، خالی پن تھا

کل اور آج
اور آنے والے کل کے بھنور سے
چکراتے اوسان لیے
اک جست بھری تھی
اور پھر میں بھی، اُس سیال کے
خالی پن کا حصہ بنا تھا
خود سے نکل کر، پیچھے ہٹتے
ایک انوکھی یکتائی میں لامحدود ہوا تھا

فیصل ہاشمی/ناروے

نہ شہر گرد ہوا میں نہ دشت گرد ہوا
کہ میرا مسئلہ دل تھا سو غم نورد ہوا
ہم اپنے حال خرابوں کی بات مت پوچھو
زمانہ ساتھ چلا تو زمانہ گرد ہوا
کسی کے وصل کی خواہش نکل گئی دل سے
کسی کے ہجر کا آتش کدہ بھی سرد ہوا
ازل سے گرچہ مسلسل خزاں کی زد پہ ہے
مگر یہ عشق کا پودا کبھی نہ زرد ہوا
کسی کے ترکِ تعلق کی دیر تھی ارشد
زمیں نورد اچانک خلا نورد ہوا

ارشد شاہین/ناروے

میں چاہتا ہوں تو یک دم ہی چھوڑ جائے مجھے
یہ ہر گھڑی ترے جانے کا احتمال نہ ہو
میں چاہتا ہوں محبت سرے سے مٹ جائے
میں چاہتا ہوں اُسے سوچنا محال نہ ہو
میں چاہتا ہوں محبت مجھے فنا کر دے
فنا بھی ایسا کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
میں چاہتا ہوں محبت مرا وہ حال کرے
کہ خواب میں بھی دوبارہ کبھی مجال نہ ہو
میں چاہتا ہوں کہ میں زخم زخم ہو جاؤں
اور اس طرح کہ کبھی خوف اندمال نہ ہو

جواد شیخ/ناروے

بے بسی نے مار ڈالا ہے مجھے
بے کسی نے مار ڈالا ہے مجھے
آپ سے مجھ کو اُمیدیں تھیں بہت
آپ ہی نے مار ڈالا ہے مجھے
بے خبر تھی زندگی کرتا ہوا
آگہی نے مار ڈالا ہے مجھے
یہ تعلق داریاں اُف کیا کہوں
دوستی نے مار ڈالا ہے مجھے
خون اپنوں کا ہی پانی ہو گیا
جان جی نے مار ڈالا ہے مجھے
دست و بازو ہی گلے کو پڑ گئے
بے رُخی نے مار ڈالا ہے مجھے
جتنا جینا تھا اندھیرے میں جیا
روشنی نے مار ڈالا ہے مجھے
میں بھرے گھر میں اکیلا رہ گیا
خانگی نے مار ڈالا ہے مجھے
سو گیا اور پس میں جاگا ہوا
زندگی نے مار ڈالا ہے مجھے

محمد ادریس لاہوری/ناروے

افسانہ

دشتِ زندگی

آسناتھ کنول/لاہور

اپنے ہی وجود کے اندر لگی اُس نامعلوم سی آگ کو سرد کرنے کی جدوجہد میں وہ زندگی کے بے شمار سال گزار گئی تھی۔ آگ جو کبھی سرد نہیں پڑتی تھی مگر وہ شعلوں کی برف سے اپنے جلتے وجود کو ٹکور کرنے لگتی۔ شاید کچھ سکون ملے جلتی ہوئی آنکھوں میں انگار اُتر آتے۔ دل پھڑپھڑاتے پرندے کی مانند پسلیوں کا جال توڑ دینا چاہتا تھا۔ کیوں آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ اک سوالیہ نشان اس کے کانپتے وجود کو گھیرے میں لے لیتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ سوچ کی وادی میں جا اُترتی۔ جہاں کبھی دور تک رعنائی تھی اس کے دل کی انگنائی میں ڈھول تاشے بجتے تھے۔ جہاں آج ویرانیوں کا راج تھا۔ ہائے نغمہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ سہیلیاں پوچھتی پڑوسنیں سمجھانے آ جاتیں۔ مگر دل وہ باتیں کہاں سمجھتا تھا اُسے تو اپنے رانجھن کی یاد سے ہی نکلنے کی فرصت نہ تھی۔ زندگی بے قدری اور بے ثباتی کے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ آج بھی وہ بے طرح مچلی تھی۔ ہمسائے میں شادی تھی اُس کی بچپن کی سکھی آج دلہن بن کر پیا کے دیس سدھارنے والی تھی۔ وہ اسے مل کر کیا آئی کہ اس کے اپنے سارے زخم ہرے ہو گئے۔ جب بھی وہ کسی تازہ دم شرمائی لجائی دلہن کو دیکھتی اُس کے وجود میں کیلیں گڑ جاتیں کانٹے سے چبھنے لگتے۔ ایک دشت سارے وجود پر اُتر آتا۔ آنکھیں ساون بھادوں تو بن جاتیں مگر دشت کی پیاس نہ بجھ پاتی۔ اُسے کتنے ہی سال پہلے کا وہ دن یاد آیا جب وسیم اس کا تایا زاد اُسے بیاہنے دلہن بن کے آیا تھا۔ بانکا سجیلا وسیم جسے نغمہ جیسی حسین بیوی ملی تھی بچپن کی محبت تھی۔ جتنے خوش ہوتے اتنا کم تھا۔ زندگی کا مقصد مل گیا تھا اور بھلا چاہیے کیا۔ رنگ و نور سے بھری وہ رات بھلا کوئی بھول سکتا تھا۔ وسیم کی محبت کی نرم پھوار نے نغمہ کا تن من رسیلا کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کی تابانی پر تو کسی کی نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ محبت کا ایسا رنگ چڑھا تھا کہ اپنا پرایا رشک کرتا تھا۔ مگر یہ حسین لمحات ایک ماہ کے بعد ہی ختم ہو گئے۔ جب وسیم کا امریکہ کا ویزہ آ گیا اور وہ نغمہ کو اپنے پاس بلا لینے کا وعدہ کر کے اسے روتا دھوتا چھوڑ کر چلا گیا۔ وقت تنہائی کی گود میں کٹنے لگا اور نغمہ کے وجود میں اک اور وجود کی خبر نے سارے خاندان کو نہال کر دیا۔ ساس سسر تو ہر ممکن اس کی دلجوئی کرتے مگر وہ برہا کی ماری کسی کا یقین نہ کرتی۔ شروع شروع میں تو وسیم کے خط اور فون آتے رہے۔ وہ لمبی لمبی باتیں کرتے اور خط لکھتے۔ یونہی یاس اور نراش کے چکر کے درمیان وقت گزر گیا اور وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ نغمہ تڑپ تڑپ گئی کہ وسیم کو پتہ چل جائے۔ مگر نہ وسیم کا فون ملتا نہ خط کا جواب آتا۔ درد کے بھرے گراں میں غوطے کھاتی نغمہ ویرانی کی تصویر نظر آنے لگی۔ اپنے حسین دلہا کے انتظار میں زندگی گزارنے لگی۔ ایک سال دو تین چار ظلم تھا سراسر ظلم۔ نغمہ کا انتظار جواب دے گیا تھا۔ نہ راتیں چین لینے دیتی نہ دل آرام سے گزرتا۔ بے قراریاں اس کے وجود کو چرکے لگاتیں۔ بستر پر تنہا لیٹی وہ بس کروٹیں بدلا کرتی۔ بچہ سکول جانے لگا تو وہ اور تنہا ہو گئی۔ اپنے ہی آپ سے شکوے کرتی کبھی خدا سے شکوہ کناں ہوتی ساری زندگی کی محبت سمٹ کر اک مرکز پہ آئی تو ہمت کے پھولوں سے بھری یہ کیاری کسی ان دیکھے طوفان میں اُجڑ گئی۔ برباد ہو گئی۔ آخر ایسا کیا گناہ ہوا تھا۔ وہ اکثر سوچ سوچ کر نڈھال ہوتی رہتی۔ سوکھ کر کانٹا ہوتی جاتی تھی۔ ماں باپ سے بھی وسیم کا رابطہ بس برائے نام ہی تھا۔ سارا خاندان تشویش میں مبتلا رہتا۔ خیر دور ہوتے یا بے وفائی کی یہ کوئی پہلی مثال تو نہ تھی۔ ہر دوسرے چوتھے گھر میں بعین یہی داستان کسی نہ کسی رنگ میں دہرائی جاتی ہے۔ باہر جانے والوں کا دکھ تو دور کا ہوتا ہے کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر جینے کے سامان اور جدوجہد انسان کو کس طرح اپنوں سے دور کر دیتی ہے۔ وہ جذبات کو کتنا سستا اور چھچھلا بنا دیتے ہیں۔ خود ہی بکاؤ مال بن کر پھرتے ہیں کہ کوئی بھی انہیں آ کر خرید لے جو اچھے دام دے بندہ اُسی کا ہو جائے۔ زندگی ایسی تو نہ تھی انہوں نے تو ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں اُسی وقت سے دہرانی شروع کر دی تھیں جب پڑھائی کا زمانہ شروع ہی ہوا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اک دوسرے کے لیے بنے ہیں تو پھر دوری کا یہ ناگ کہاں سے سرسراتا ہوا آ گیا اور نغمہ کو ڈس گیا تھا۔ وہ آج بھی حسب معمول اپنے کمرے میں ٹیبل کے پاس بیٹھی وسیم کی جدائی کو رقم کر رہی تھی۔ اک ہوک سی لبوں پر سجائے کہ شاید اُس کا فون آ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ گھنٹی بجتی رہے اور وہ ادھر اُدھر ہو تو فون مس ہو جائے۔ مگر ضروریات اور مجبوریاں تو

کہیں بھی ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں۔ وہ سوچوں میں گم تھیں کہ اماں بہت اُداس نظر آئیں۔ اُداس تو وہ بھی رہتی تھیں مگر آج اُداسی کی نوعیت پریشانی میں بدلی ہوئی تھی۔ سارا خاندان جیسے سوگ کی کیفیت میں گھوم رہا تھا۔ کیا ہوا تائی اماں وسیم کی کوئی خبر خلافِ توقع اماں خاموش رہی۔ اماں کچھ تو مجھے بتا دو۔ میرا دل بڑا پکا ہے مروں گی نہیں۔ وسیم کو کچھ ہوا ہے؟ کیا اُس نے وہاں شادی کر لی ہے۔ مجھے طلاق بھیج دی ہے یا وہ مر گیا ہے۔ نغمہ نے بڑی بے رحمی سے یہ سوال پوچھے تو اماں کا کلیجہ کٹ گیا۔ چپ رہ ایسی بری باتیں منہ سے نہ نکال۔ اماں اب میرے لیے کون سی اچھی بات رہ گئی ہے۔ میرا بیٹا 5 سال کا ہو گیا ہے۔ سب کے باپ ہوتے ہیں۔ اس کا نہیں ہے۔ کیا جواب دوں اُسے اماں پھر تڑپ اُٹھیں۔ زندہ ہے اس کا باپ خیر سے۔ اماں میرے لیے تو مر چکا ہے نا۔ اپنے 5 سال کے بچے کو ابھی تک وہ بدنصیب نہیں دیکھ سکا۔ اکیلی دلہن کو وہ چھوڑ کر ایسے گیا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔ یہی دکھ تو میری جان لے رہا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ تو نے تو وفا نبھائی ہے اب پتہ نہیں اس خیر جوگے کے ساتھ کیا گزری۔ سارے رشتے سارے تعلق کیسے بھلا دیے اُس نے۔ اماں کوئی بات ہے ضرور جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہو۔ کیا بتاؤں تمہیں۔ جیون جوگے دو سال بعد ہی اس نے وہاں شادی کر لی۔ ایک امریکن گوری کے ساتھ۔ وہ ایک امیر لڑکی تھی اسے پیسے کا لالچ تھا۔ وہ لڑکی اتنی چالاک تھی کہ اس نے اسے پوری طرح قابو کر لیا۔ وہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھتی۔ وہ اس کے فارم ہاؤس کا مالک نہیں بلکہ ملازم تھا۔ نہ وہ خط لکھ سکتا تھا نہ فون کر سکتا۔ بس اسی کی نوکری پہ رہتا۔ پہلے پہل تو وہ بڑا خوش تھا کہ امیر عورت مل گئی ہے۔ اب پچھتا رہا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا اماں۔ ویسے ہی تو لوگ اپنے پیاروں کو نہیں بھولتے نا۔ کہاں سے پتہ چلا یہ سب۔ نغمہ پھر سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ آنسوؤں کی دُھند میں کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اماں اچانک وہ اماں سے مخاطب ہوئی۔ اسے لکھو کہ مجھے طلاق بھیج دے۔ ہائے میں مر گئی۔ اماں بدحواس سی ہو کر بولی۔ ایک تیرا اور بلو کا ہی تو سہارا کہ ہم جی رہے ہیں ورنہ کب کے مر کھپ جاتے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دن آ ہی جائے۔ اماں روتے روتے پُراُمید لہجے میں بولی۔ مگر اماں وہ میرے لیے نہیں تمہارے لیے ہی آئے گا۔ اس نے میری محبت کو تار تار کر دیا۔ میری وفا اور محبت کا یہ صلہ تھا۔ میرا قصور بتاؤ۔ اماں اب نہیں۔ میرے لیے نہیں۔ اکیلی زندگی گزار لوں گی مگر اسے زندگی میں شامل نہیں کروں گی۔ وہ اکیلا وہاں کسی مصیبت میں ہوتا تو معاف کر دیتی مگر وہ تو شادی کر کے مصیبت میں پڑا۔ ہم اس کے لیے کچھ بھی نہ تھے۔ کتنی جلدی بھول گیا اب ہم اس کے کچھ بھی نہیں ہیں۔ نغمہ آنکھوں میں برسات لیے اپنے کمرے میں آئی اور تڑپ تڑپ کر رو دی۔ اللہ تو نے میری کیا قسمت لکھی۔ شام کو تایا کہ گھر آنے پر اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ تائی اماں نے سب کچھ ان کے گوش گزار کیا اور یہ بھی کہ نغمہ طلاق چاہتی ہے۔ تایا جان افسردہ ہو گئے۔ غلطی تو ہمارے ہی بیٹے کی ہے۔ نغمہ بیٹی کو کیوں کہہ رہی ہو۔ وہ حق پر ہے۔ پچھلے 6 سال سے وہ اس کا انتظار کر رہی ہے اور وہ بدبخت اپنا بیٹا بھی دیکھنے نہیں آ سکا۔ وہ جیسا چاہتی ہے اسے کرنے دو۔ تو اس کے بچے کا کیا ہوگا کچھ نہیں جیسا اس کی ماں بہتر سمجھے گی۔ کیا مطلب۔ اماں چونک گئی۔ وہ ہمارا بچہ ہے ہمارا خون ہے ہمارے پاس رہے گا۔ تائی اماں نے فیصلہ سنایا۔ نہیں نسرین بیگم پہلے وہ باپ سے محروم ہے اب کیا اُسے ماں سے بھی چھین لو گی۔ تائی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں کہتی ہوں آپ ایک دفعہ اور بیٹے سے رابطہ کر کے اُس سے پوچھ لو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ پھر بے شک نغمہ طلاق لے کر گھر بسا لے۔ تائی اماں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو دامن میں جذب ہونے لگے۔ تایا بھی افسردہ ہو گئے۔ اچھا پتہ کرتا ہوں۔ نغمہ بیٹی کہاں ہے تایا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ اپنے حالات پہ روتی رہتی ہے۔ بیٹا بھی افسردہ رہتا ہے۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ اُس نے لڑکے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ تایا نے کسی نہ کسی طرح سے وسیم سے رابطہ کیا تو آگے سے جواب ملا جو مرضی کریں۔ تم نغمہ کو طلاق دے دو۔ ٹھیک ہے میں کاغذات دستخط کر کے بھیج دیتا ہوں۔ وہ عدالت میں جمع کرائے اور خلع لے لے۔ تایا اور تائی کا تو دل ہی بیٹھ گیا۔ کتنا مان تھا اس کج بخت پر۔ بڑھاپے کا سہارا ہوگا۔ مگر کچھ نہیں۔

نغمہ نے طلاق لے کر نوکری کر لی۔ بیٹے کو پڑھا لکھا کر اس قابل کیا کہ وہ ماں کا سہارا بنے۔ باپ کی بے وفائی تو اُسے ازبر تھی۔ ماں کے کبھی نہ ختم ہونے والے آنسو اس کے اندر اک آگ سلگائے رکھتے۔ یکے بعد دیگرے۔ فاروق کے دادا دادی بیٹے کو سینے سے لگانے کی حسرت میں اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ اپنا گھر، فاروق کے نام کر گئے اور ایک دن اس نے دادا کا گھر فروخت کر دیا اور اس کو لے کر کراچی چلا آیا

جہاں اُسے نوکری مل گئی تھی۔ سارا دن وہ بیٹے سے وعدہ لیتی رہتی کہ وہ اپنے باپ کی طرح نہ کرے اور وہ ماں کے سر کی قسمیں کھاتا رہتا۔ وقت نے نغمہ کا سر سفید کر دیا۔ شادی کے بعد صرف ایک مہینہ شوہر کے ساتھ رہنے والی کو شوہر سے جدا ہوئے 30 سال ہو گئے تھے۔ وہ دوسرا گھر بنا ہی نہیں سکی کہ دلوں میں گھر تو صرف ایک ہی دفعہ بنتے ہیں۔ آج حسبِ معمول وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔ اماں کدھر ہو۔ وہ ماں کو پکارتا پھرتا تھا۔ نغمہ جائے نماز اُٹھا کر باہر آئی۔ آج اتنی جلدی ہاں اماں آج ایک آدمی ملا۔ اتنا اُجڑا ہوا اور اُداس کہ کیا بتاؤں۔ وہ میرے آفس آ گیا تھا۔ ایسے لگا جیسے اپنا سب کچھ لٹا کر آ گیا ہو۔ اُسے نوکری کی ضرورت تھی۔ ایک بات پہ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ بار بار مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، پوچھنا چاہتا ہو۔ میرا نام پوچھا۔ ماں کا دادا دادی کا نام پوچھا۔ اپنے گھر کا ذکر کیا۔ مگر میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اچھا ہوگا کوئی۔ ایسوں چپکنے والے لوگوں کو منہ نہ لگایا کرو۔ میں اُسے ایدھی شیلٹر ہوم میں چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ وہ بار بار میرا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اتنی اپنائیت کا اظہار کر رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ گھر لے آتا ہوں۔ پھر مناسب نہ لگا۔ اچھا کیا بیٹا۔ اماں باپ کے زندہ ہونے کے باوجود آج تک زندگی میں اس کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ ہر بوڑھا آدمی باپ جیسا لگتا ہے۔ فاروق اُداس ہو گیا۔ اچھا سنو مہ خالہ رضیہ بتا رہی تھیں کہ دو تین رشتے ہیں ان کے پاس۔ تم کہو تو بات چلاؤں۔ اب سونا گھر اچھا نہیں لگتا۔ ٹھیک ہے ماں جو مرضی کر۔ نغمہ بیگم خوش ہو گئی اور پھر اُسے بیٹے کے لیے ایک لڑکی پسند آ ہی گئی۔ یوں دو ماہ کے اندر اندر ثانیہ بہو بن کر نغمہ کے گھر آ گئی۔ گھر میں ایک رونق ایک ہنگامہ رہنے لگا۔ نغمہ کی اُداس زندگی میں کتنی بڑی خوشی آ گئی تھی۔ وہ سب غم بھول گئی۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک دن فاروق کو ایدھی سنٹر سے فون آیا کہ وہ جی بزرگ کو داخل کروا کر گئے تھے۔ وہ بسترِ مرگ پر ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اچھا وہ حیران سا ہوا۔ اوکے میں آ رہا ہوں۔ وہ ایدھی سنٹر پہنچا تو وہ بزرگ اُسی کی راہ تک رہے تھے۔ جی بابا جی وہ ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بابا جی نے اُس سے کہا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ آگے کرو۔ فاروق نے ہاتھ آگے کیا تو ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ تم رکھ لو۔ یہ کیا ہے فاروق نے حیرت سے پوچھا۔ بس تم رکھ لو یہ میری خواہش ہے۔ تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ یہی میری کہانی ہے۔ پڑھ لینا اور سبق حاصل کرنا۔ جی ضرور۔ فاروق نے ہاتھ آگے کیا تو بابا جی نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ کان اِدھر کرو۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ ان کے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں اب نہیں جیوں گا شاید یہ میری زندگی کے آخری لمحے ہیں۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے معاف کر دے۔ یہ میری آخری التجا ہے میرے بیٹے۔ میں وسیم ہوں بدبخت وسیم۔ اس کے ساتھ ہی فاروق کے ہاتھ دباتا ان کا ہاتھ بے جان ہو گیا۔ کھلی آنکھیں فاروق پر جمی تھیں۔ وسیم اقدس اس کا اپنا باپ جسے وہ کبھی بابا نہ کہہ سکا ملا بھی تو اس کسمپرسی میں۔ ایدھی والوں نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ ابھی رُکیے فاروق نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔ میں اپنی ماں سے پوچھ لوں۔ اُس نے فون ملایا۔ ماں فاروق نے وسیم کی ساری کہانی کہہ سنائی۔ میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ فاروق تم نے اپنا باپ دیکھ لیا ہے۔ تمہاری یہ حسرت پوری ہو گئی ہے۔ اب اُسے دفن کر آؤ۔ مجھ میں اسے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ وسیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے دفن کے سارے اخراجات میں ادا کروں گا۔ ایدھی سنٹر والوں نے بڑی کوشش کی کہ اس کا راز جان سکیں۔ یہ میرے بزرگ ہیں مدتوں بعد اس حالت میں ملے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ مقامی قبرستان میں دفن کرنے کے بعد فاروق گھر آیا تھکا ہوا ٹوٹا اور مرجھایا ہوا سا۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر وہ بولا۔ ہر انسان اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ میرا باپ بھی نہ جانے کیسے کیسے حالات سے گزر کر خاک ہو گیا۔ نغمہ بیگم ستی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ گھر میں سوگ کی کیفیت طاری تھی۔ جب بہو نے انہیں اک خوشخبری سنائی۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ ایک روح نے ناطہ توڑا تو دوسری نے دنیا میں قدم رکھا۔ یہی نظامِ زندگی ہے بس اس سٹیج پر ہر کوئی اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ کوئی اچھا کوئی برا۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نغمہ پرسکون تھی۔ اُس نے ساری بے قراری یک لخت ختم ہو گئی تھی۔ یوں لگا جیسے صدیوں کی تھکن نے اپنا راستہ موڑ لیا ہو۔ اچانک اُسے لفافے کا خیال آیا۔ اماں بابا نے ایک لفافہ دیا تھا۔ اُس نے جلدی سے لفافہ باہر نکالا۔ اُس میں ایک طویل خط تھا۔ نغمہ اور وسیم کے نام اور اُس کے ساتھ دستخط شدہ چیک کی ایک کاپی۔ کچھ دیگر کاغذات تھے نغمہ خط پڑھنے لگی۔ بیٹے نے چیک بک دیکھی۔ ایک کروڑ ڈالر کے چیک ساری زندگی میں اپنی زندگی گروی رکھنے کی قیمت تھی جو فاروق کے لیے اس نے چکائی تھی۔ امریکہ میں اس کی پراپرٹی بھی فاروق اور نغمہ کے نام تھی۔ مگر وہ ان کے پاس اب بھی نہیں تھا۔

جیالا

گل زیب عباسی/بہاول نگر

مارچ کی صاف شفاف صبح میں بچے اٹکھیلیاں کرتے سکول کی جانب بڑھ رہے تھے۔ زیرِتعمیر سڑک پر پتھر بکھرے پڑے تھے۔ سکول کے گیٹ کی جانب سے لنک روڈ اچانک ہی زیرِتعمیر سڑک سے آ ملتی تھی۔ ہلکا سا بادل کا ٹکڑا خورشید کی نگاہِ ناز پر پردہ ڈالنے میں کوشاں تھا کہ یکا یک فضا موٹر سائیکل کی بریک لگنے سے گونج اٹھی۔ سکول کے طلباء اور راہ گیر جائے حادثہ کی جانب لپکے۔ ہجوم بڑھا تو بعد میں آنے والے افراد پہلے سے موجود لوگوں کے کندھوں سے اُچک اُچک کر دیکھنے لگے۔ حادثہ کس قدر شدید ہے؟ کوئی جانی نقصان ہوا یا فقط زندگی اپاہج ہو کر بیٹھ گئی۔ سرنواز نے جس پھرتی سے بریک لگائی تھی، اُس سے یہی شائبہ ہوتا تھا کہ حادثہ سنگین ہوا ہے اور نقصان بھی لیکن سرفراز کی بے تابانہ آواز میں ڈھارس تھی۔

"بچ تو گیا جیالے؟"

"جی بچ گیا سر"

جیالے کی کالج کی کتابیں سڑک پر بے ترتیب پڑی بجری، پتھروں پر بکھر گئی تھیں۔ وہ جھک کر کتابیں اُٹھانے لگا۔ اس کے چہرے پر بشاشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ بشاشت جو فقط جیالے کے رُخِ ماہتاب ہی کا خاصا تھی۔ اُس نے سپاٹ سے چہرے کے ساتھ کتابوں کو جھاڑ پھونکا۔ پنکچر سی سائیکل کے کانوں سے پکڑا اور کالج کی راہ لی۔ وہاں پر ہجوم بھی منتشر ہونے لگا۔ مگر اُستاد نواز کی نظریں کچھ اور تذبذب میں پڑ گئیں۔ حادثے سے بڑا حادثہ یہ تھا کہ جیالے نے خلافِ مزاج اُستاد نواز کی جانب نظر اُٹھائی تھی جیسے وہ اپنے استاد کو نہیں، کسی اور آدمی کی جانب نظر اُٹھا رہا ہو اور یہ بھی سچ تھا کہ اُستاد نواز کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جیالا لازم "گتھم گتھا ہوتا، گالی گلوچ کرتا اور پھر گلی میں آتے جاتے لوگ منصف بنتے۔ آخر سائیکل کو موٹر سائیکل کی ٹکر گئی تھی۔ اگرچہ وہ بے ضرر تھی۔ موٹر سائیکل کا پہیہ بریک لگنے کی وجہ سے سائیکل کے اگلے پہیے کو فقط چھو ہی پایا تھا اور سائیکل ڈگمگا بھی گئی تھی اور اسی وجہ سے کیریئر میں ٹھنسی کتابیں نیچے جا گری تھیں۔

اُستاد نواز جیالے کی بے اعتنائی نظروں کا ملزم حادثے کو قرار نہیں دے سکتا تھا۔ وہ تو بڑا شوخا اور چلبلا سا اکیس بائیس سالہ جوان تھا۔ سجیلا گبھرو، پہلی نظر میں من کو موہ لینے والا متبسم چہرہ، یقیناً وہ گھر سے ہی "آف موڈ" میں نکلا تھا۔ موڈ جس قدر بھی آف ہو، اُستاد کو تو کم از کم وہ سیدھے سبھاؤ ملتا، بلکہ اس کا اخلاقی فرض تھا کہ استاد کو معذرت کرتا اور پھر کالج..... کتابیں اُٹھانا، نواز صاحب کے چہرے پر پھیکی سی نظر پھینکنا اور پھر سکول سے کالج کی جانب بے تکا سا لڑکھڑاتے ہوئے نکل جانا، بے معانی سے تھا۔ اُستاد نواز کے خیالات پر غلاف سا چڑھ گیا، سکول کی گھنٹی ہوئی، اسمبلی ہوئی، مگر اُستاد نواز کے ذہن میں اضطرابی، بے قراری اور نا اُمیدی کے محاذ کھل گئے تھے، وہ تو اپنے تئیں بچوں کو مطمئن کرتا ہے، غم خواری کرتا ہے، اپنے شاگردوں سے غایت درجہ اُنس رکھتا ہے، پھر یہ ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر جیالے کے ساتھ تو روابط بھی گہرے تھے، عمومی صورت ہوتی تو شاید اُستاد نواز اسی قدر تذبذب میں نہ پڑتا، لیکن جیالا...... تو بہت قریب، بلکہ خاص...... خاص الخاص شاگرد تھا۔

اُستاد نواز اُردو ادب کا اُستاد تھا۔ شعر و شاعری کا دلدادہ اور افسانہ نگاری میں طاق، سکول کی ہائی کلاسز کا اصرار ہوتا کہ اُردو کا پیریڈ اُستاد نواز ہی پڑھائے اور ہیڈ ماسٹر بھی اُردو ادب کا پیریڈ انھیں تفویض فرماتا، تاکہ بورڈ میں رزلٹ اچھا رہے۔ اُستاد نواز شاگردوں میں گھل مل جاتا، ان کے دکھ درد میں سچے اُستاد کی مانند شریک ہوتا، اس سے بچے بھی اُسی قدر مانوس ہوتے جس قدر وہ ان کو قربتیں دیتا۔ دسویں جماعت کا پیریڈ جس استاد نواز کے پاس آیا، تو اس نے بچوں سے رسمی تعارف مانگا، تو جیالا بھی کھڑا ہوا، اُستاد نواز نے پوچھا "ہاں بھائی جوان! کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی رمضان"

"کہاں سے آتے ہو؟"

رمضان کے گورے سفید چہرے پر یکا یک ہنسی کے فوارے برس پڑے۔ اُس نے جواب دینے کی بجائے، اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا، گویا وہ مزید اُگلنے سے گریزاں ہوں، اُستاد نواز نے دوبارہ پوچھا، تو قریب ہی بیٹھے دوسرے بچے نے جھٹ کہہ

دیا۔
"اسی گاؤں سے آتا ہے سر، مستری ہے جی، اس لیے شرما رہا ہے۔"
"بھائی شرماتی تو لڑکیاں ہیں، جوان آدمی بھلا شرمایا کرتے ہیں!"
پھر بات کا موضوع بدل گیا اور روزانہ درس و تدریس کا سلسلہ چل نکلا، رمضان قطعی طور پر ذہین بچہ تھا، آموختہ یاد کرنے میں اناڑی نہیں تھا۔ البتہ اُس کا بلاوجہ ہنسے جانا، جماعت بھر میں مشہور تھا، گوری رنگت، دھان پان بدن، پھرتیلی طبیعت، چہرے پہ ٹپکتا شباب، کالی سیاہ مونچھیں، غلامی آنکھیں اور آنکھوں میں ہمہ وقت سُرمے کا ڈیرا اور تیکھی نظر ڈالنا، اس کا وطیرہ تھا، اُستاد نواز کو تو شعر اُچھالنے کے لیے ماحول چاہیے تھا، رمضان کے سرے پر اکثر گرما گرم اشعار اُچھل پڑتے اور حیران بھی کہ ایک ہی وقت میں ہر ڈھنگ اور ہر مطلب کا شعر آجاتا ہے اور رمضان کی شرارتوں کو تو شعروں سے ہی روکا جاتا اور رمضان جواباً مسکرانے سے کام لیتا۔ رمضان جہاں ذہین تھا وہاں بلا کا غریب بھی، ماں باپ بمشکل گزارہ کرتے مگر بچوں کو سکول بھیج رہے تھے۔ اُستاد نواز کی یہ بھی فطرت میں تھا کہ غریبوں کو زیادہ قربت میں رکھتا۔ رمضان پر بھی اُستاد نواز کی مہربانی غربت کی وجہ تھی، رمضان کو یقین ہوگیا کہ اُستاد نواز دیگر اساتذہ کی مانند ڈنگ ٹپاؤ نہیں ہے، تو وہ بھی اپنی مشکل بیان کرنے لگا۔ یوں اُستاد شاگرد کا یہ رشتہ بہترین تعلق داری میں ڈھلتا گیا۔ مگر آج کے بے ضرر حادثے نے اس تعلق داری کو زبردست دھکا لگا دیا۔ اُستاد نواز خلاف معمول خاموش دیکھ کر دیگر اساتذہ نے پوچھا بھی مگر نواز صاحب نے بھی حادثہ کو رنگین بنا کر پیش کر دیا اور اصل مدعا گول کر گیا۔

"حادثہ...... جیالے کی جرات آموز شوخیاں...... بالکل بے معانی نظروں کا جھکاؤ...... اور خاموشی سے چل دینا۔" نواز صاحب کے ذہن میں خیالات کے طوفان اُمڈ رہے تھے کہ پیریڈ تبدیل ہوا اور جیالے کا چھوٹا بھائی شہزاد نظر آ گیا۔ نواز صاحب نے بلا بھیجا۔ شہزاد حسب معمول نظر آیا، اس کے چہرے مہرے سے خلاف معمول کچھ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا، مگر پھر بھی نواز صاحب نے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں بھائی گھر میں خیریت تو ہے؟"
"ہاں سر سب ٹھیک ہیں، ابو کچھ دنوں سے علیل ہیں اور اب تو وہ بھی ٹھیک ہیں۔"
"آج تمہارا جیالا موٹر سائیکل کے نیچے آ کے مر ہی گیا ہوتا، مگر بریک نہ لگائی ہوتی۔"
"کہاں، کب جی؟"
"آج صبح، سکول کھلنے سے ذرا پہلے...... بے دھیانی سے سائیکل چلا رہا تھا کہ موڑ کی دوسری جانب سے میں نکل آیا، حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"
"گھر میں تو ٹھیک تھا سر۔"
"میں سمجھا شاید گھر سے ڈانٹ ڈپٹ ہوگئی ہو اس لیے بے دھیان تھا۔"
"نہیں سر، ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

اُستاد نواز نے اپنے سر سے سندھی ٹوپی اُتاری اور گنجے سر کو کھجانے لگا۔ دال میں کالا ضرور تھا، ورنہ جیالے کی طبیعت ہی ایسی تھی کہ وہ رُکتا اور اُستاد سے بے تکلفی میں کچھ کہتا۔ جیالے نے بے تکلفی میں کبھی بھی احترام اور وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اُس کا مذاق بھی شستہ مذاق تھا۔ جس سے ہر آدمی محظوظ ہوتا، اور اُس کی ہر دلعزیزی میں اس مذاق کا بھی ہاتھ تھا، لیکن یوں اجنبی سا ہو کر روزانہ ہونا، سمجھ سے بالاتر تھا، سر کھجاتے ہوئے نواز صاحب کے سامنے جیالے کا مکمل سراپا تھا، وہ اُسے اب بھی وہی پہلے روز والا ہنس مکھ رمضان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے گریبان میں دھیان کیا شاید اُس سے کچھ غلط ہوا ہو، ایسا بھی نہیں تھا، بلکہ جیالا تو اُسے اپنا غم گسار، محسن اُستاد تسلیم کرتا تھا۔ وہ کالج میں داخلہ نہیں لے رہا تھا تو نواز صاحب نے ہی سمجھا بجھا کر داخلہ دلوایا تھا۔ وہ اب بھی ویسے ہی تھا۔ مگر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں ہوئی، نامعلوم تھا۔

اُستاد نواز جیالے کی شرافت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ جیالا بے ہودہ محافل سے کوسوں دور تھا۔ گفتگو شائستہ مگر پر مزاح تھی۔ چھوٹے بڑے کا ادب و احترام برابر تھا، پانچوں وقت مسجد میں ہوتا، بلکہ مسجد کے امام کی موجودگی میں بچوں کو سبق بھی دیتا، اہل محلہ کے نزدیک بھی باکردار تھا، اُستاد نواز ہر پہلو، ہر جہت پر سوچ رہا تھا مگر نتیجہ صفر ہی تھا۔ اُستاد نواز کی اُلجھن اور بے قراری بھی غلط نہیں تھی۔ جیالا ذرا بھی مشکل میں ہوتا تو نواز صاحب کو کال کرتا اور پھر نواز صاحب اپنی سندھی ٹوپی سر سے ذرا اُوپر کرتے، کوئی شعر پھینکتے اور فیصلہ صادر کر دیتے۔
"فکر نہ کر جیالے، میرے بچے، سمجھ کام ہو گیا۔"

''سر جی بڑی مہربانی آپ کی۔''

''میرے بیٹے! میرے بچے! مہربانی کس بات کی؟ یہ تو والدین کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کی مشکلات حل کریں۔ میں نے کون سا تیر مارا ہے کہ جھکے جا رہے ہو اور تم تو جیالے ہو......''

اور جیالا ابھی وہ پہلا واقعہ یاد کر کے ہنس دیتا۔

اُس روز رمضان اور اس کا ہم جماعت افضال اچانک اُردو کے پیریڈ سے غائب ہو گئے تھے، نواز صاحب پیریڈ میں آئے تو ان دونوں کو غائب پا کر پوچھا ''ہاں بھائی جوانو! وہ کہاں ہیں؟ وہ پتلا سا بچہ؟ جو ان کے ساتھ بیٹھتا ہے۔''

استاد نواز نے رمضان کے بارے میں ہی پوچھا تھا، جواباً دوسرے بچے نے بتایا تھا۔

''سر پتا نہیں کہاں ہے؟''

''اچھا جب آئیں تو میرے پاس بھیجنا، بورڈ کا امتحان دینا ہے اور کلاس میں ہوتے نہیں۔''

استاد نواز حسب معمول پیریڈ پڑھا آئے، تو رمضان اور افضال بھی آ گئے، طلباء نے نواز صاحب کے پاس بھیج دیا، نواز صاحب پہلے تو ذرا خفا ہوئے مگر جلد ہی نرم پڑ گئے۔

''ہاں بتاؤ سرکار کہاں گئے تھے، کیوں غائب ہوئے؟''

''وہ جی شہر گئے تھے۔''

''وہ کیوں؟''

''کتابیں چاہیے تھیں۔''

''پوچھ لیتے، چھٹی بھی تو لی جا سکتی ہے، بڑی جرات ہے، بڑے نڈر لوگ ہیں آپ تو؟''

''نہیں جی...... کتابیں تو لینا ہی تھیں نا''

''نہیں جی کے بچے، میں نے کب کہا کتابیں نہ لو۔ پوچھنے میں حرج ہی کیا تھا، بڑے جیالے بنتے ہو خود کو...... آج سے تم لوگ دسویں کلاس کے جیالے ہو گئے...... چلو کلاس میں۔''

اور پھر رمضان اور افضال کو اُستاد نواز جماعت میں جیالے ہی کہتا۔ سبق سننا ہوتا تو بھی جیالے کے نام سے ہی کھڑا کیا جاتا۔ رفتہ رفتہ یہی نام عام ہونے لگا۔ رمضان کو بھی ''جیالا'' نام سننے کی عادت سی ہو گئی اور پھر افضال تو سکول ہی چھوڑ گیا اور رمضان تنہا ہی 'جیالا' بن گیا۔ اب یہ جب بھی جہاں پر نواز صاحب سے دوبدو ہوتا، وہ اسے جیالا ہی کہتا۔ گھر میں بھی جیالا نام پہنچ گیا۔

نام کی چٹ لگی یا پھر جیالا مزاجاً شریف النفس تھا۔ وہ مزید بے باکیوں اور نڈر پن سے دور ہٹ گیا۔ وہ اب مکمل طور پر ایک مثالی طالب علم بن کر اُبھر رہا تھا۔ اسی بنا پر اُستاد نواز نے جیالے کی معاونت کا سوچ لیا کہ بچہ ایک تو غریب ہے اور ذہین بھی۔ اگر ان کی اخلاقی اور تعلیمی مدد کی جائے تو اب بچے کا مستقبل تاریک ہونے سے بچ سکتا ہے۔ وہ جیالے کو ایک سفید پوش آمیز کے طور پر کسی دفتر میں بیٹھے دیکھنے لگا۔ یوں جیالے کے والدین بھی استاد نواز کے دائرہ احباب میں داخل ہو گئے۔

نواز صاحب گاہے بگاہے فون پر حال احوال پوچھ لیتا اور جیالے کو تاکید کرتا رہتا کہ وہ ڈٹ کر پڑھائی کرے اور مستقبل کو روشن کرے۔ نواز صاحب کی یہ لوف داری اور جھکاؤ بے لوث تھا۔ وہ تو اپنے شاگرد کو کامیاب اور بس کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ جیالا بھی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ استاد نواز کی اُمیدیں خاک میں نہ مل جائیں۔ جیالے کے والدین بھی اُستاد نواز کو یقین دہانی کراتے شوق سے کہتے کہ رمضان شریف اور نیک پال بچہ ہے، جو ان بلکہ خوبرو جوان ہونے کے باوجود بے داغ تھا۔ استاد نواز کو بھی مکمل یقین ہو گیا کہ جیالا دل کی ہر بات اُن سے ''شیئر'' کرتا ہے۔ مگر آج کی بے اعتنائی نظریں کچھ اور غمازی کرتی نظر آئیں، جیسے وہ نواز صاحب سے دوری چاہتا ہو یا پھر نواز صاحب کا چور ہو۔

اُستاد نواز سکول میں تو بے قراری کے عذاب سے جو گزرا سو گزرا، گھر آنے کے بعد مزید اُلجھ گیا۔ اُس نے ایک دو کتابیں بھی پلٹیں مگر دل نہ مانا، اُس نے کتابیں واپس الماری میں رکھ دیں، اُس کے ذہن میں کوئی انہونی سی خبر گونجنے لگی۔ مگر نہ جانے کون سی خبر، ایک ایسی خبر جس کا نواز صاحب کو خود بھی علم نہیں تھا۔ اُس نے گنجے سر کو پھر کھجایا، ذرا تامل کیا اور اور پھر اُس کی اُنگلیاں جیالے کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر کال "Attend" نہ ہوئی، اُستاد نواز کی کال پہلی مرتبہ "Attend" نہیں ہوئی تھی۔ جیالے کے نمبر سے خاموشی کسی بڑے حادثے کی پیش گوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُستاد نواز کی چھٹی حس صبح سے آلارم دے رہی تھی۔ دو تین مرتبہ کال جانے کے باوجود کال "Attend" نہ ہوئی تو اُس نے چھوٹے بھائی شہباز کے نمبر پر ڈائل کر دیا۔ کال "Attend" ہوئی، تو نواز صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''جیالا کہاں ہے۔ شہباز؟''

''او، جی مسجد میں نماز پڑھنے گیا ہے۔''

"کب سے؟"

"ابھی ابھی جی۔"

"وہ فون نہیں سن رہا، کی بات ہے؟"

"سیٹ تو اُس کے پاس ہے جی...... بیل خراب ہوگی جی...... "Silent" بھی ہو سکتا ہے جی۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

نواب صاحب نے فون بند کر دیا اور پھر سوچ میں پڑ گیا اور پھر تصور میں ہی جیالے پر برس پڑا۔

"گدھا کہیں کا، کوئی پرابلم ہے تو بتا کیوں نہیں دیتا، ایسے ہی ہوتے ہیں زیادہ چاؤ چونچلوں والے، چلو ٹکر ہو ہی گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور تھا، موڑ بھی تو ایسا ہی ہے، کتنے حادثے تو ہو چکے ہیں، کیا وہ سب اناڑی لوگ ہیں، ان میں سے کسی کو ڈرائیونگ آ ہیں آتی اور پھر اس میں برا منانے والی کون سی بات ہے...... پھر غصہ بھی ہے تو کم از کم کال تو سن کر بتائے...... نہیں اُسے چوٹ آئی ہوگی، شاید اس لیے......"

نواز صاحب کے پاس بڑبڑانے اور گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے گاؤں سے اُڑ کر اتنی دور پہنچ نہیں سکتا تھا۔ نواز صاحب کی بے چینی دوگنی ہوتی گئی۔ اُس نے ایک دو مرتبہ جیالے کے کلاس فیلوز سے رابطہ بھی کیا۔ مگر کوئی معقول جواب نہیں ملا۔ کسی نے بھی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ وہ ٹین ایج بچوں کے مسائل پر تفکر کرنے لگا۔ یقیناً وہ کسی کے کہنے سے اُستاد نواز سے دوری چاہ رہا تھا، وہ کون ہو سکتا ہے، والدین استاد نواز کا دم بھرتے تھے، اس کے بھائی نواز صاحب کو جی، جی کرتے نہ تھکتے تھے، تو پھر کسی ماہ لقا نے کوئی ارژنگ ڈور ڈالی ہو، نہیں، یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ نواز صاحب نے جب بھی باتوں باتوں میں جیالے سے شادی کے بارے میں پوچھا، تو اُسنے یک دم انکار ہی کیا تھا اور پڑھنے کی جانب رائے دی تھی۔

نواز صاحب شام کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ جیالے کے چھوٹے بھائی شہباز کی کال آ گئی، نواز صاحب نے نمبر دیکھتے ہی کال "Yes" کی اور بڑے تیکھے لہجے سے پوچھا۔

"ہاں، جوان خیریت تو ہے......"

"وہ جی بھائی رمضان گھر نہیں پہنچا۔"

"کیا؟"

"جیالا جی گھر نہیں پہنچا ابھی تک۔"

"کال کرتے یار!"

"کال Attend نہیں ہو رہی، بیل تو جا رہی ہے...... آ گیا جی...... وہ ابھی ابھی گیٹ سے اندر ہوا ہے۔ میں پھر رابطہ کرتا ہوں جی......"

اور پھر لائن کٹ گئی۔ مگر جیالے کا اس قدر تاخیر سے آنا، پہلی بار ہوا تھا، اب تو نواز صاحب کو یقین ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے لیکن کسی کو بھی پتا نہ ہونا، ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ نواز صاحب کافی دیر سوچتا رہا اور پھر پھر اُس نے خود ہی جیالے کو کال کر دی، ابھی بیل ہوئی تھی کہ جیالے نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"جی سر جی۔"

"گدھے، یہ کیا تماشا ہے، کوئی کال 'Attend' نہیں ہوتی اور وہ موڑ پر ٹکر ہوتے ہوئے بڑی بے رُخی نظر آئی، کیا معاملہ ہے۔"

"کچھ نہیں سر!...... آپ تو چھوٹی سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں، آپ مطمئن رہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔"

"تو یہ سب......!"

"سر میں سکول آؤں گا، میں کپڑے بدل رہا تھا۔"

"او۔ کے پھر"

اُستاد نواز مطمئن ہو گیا اور صبح سکول میں پہنچا تو یہ سن کر حیران رہ گیا کہ لجپال، شریف النفس جیالا مسجد کے امام کی جواں سال لڑکی کے ہمراہ غائب ہو چکا ہے۔

نوجوان شاعر، اُستاد پرنم الہ آبادی کے شاگرد

محمد اقبال پیام شجاع آبادی

کا اوّلین شعری مجموعہ

"اُس کا ملنا تو خواب جیسا ہے"

مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے

صفحات 128 قیمت: -/250 روپے

ناشر:

نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

ممتاز شاعر، افسانچہ نویس اور نقاد

جناب ڈاکٹر اخلاق گیلانی

کا اوّلین شعری مجموعہ

"محبت نامہ"

شائع ہو گیا ہے

ناشر: نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

دبئی اور یورپ میں چند روز

حسن عباسی/لاہور

دُنیا کے مختلف ممالک میں اُردو کی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں۔ جہاں پاکستانی کمیونٹی کے افراد آئے روز مختلف تقاریب کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بستیاں بھارت، گلف، یورپ، کینیڈا، امریکا سے لے کر آسٹریلیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مشاعرے کی روایت ان ممالک میں بڑی مضبوط اور شاندار ہے۔ مجھے گاہے بہ گاہے ان ممالک کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے اگست اور ستمبر میں دبئی اور یورپ کے عالمی مشاعروں میں شرکت کے لیے سفر کیا۔ دبئی میں ایوانِ اقبال کے چیئرمین پرنس اقبال متواتر ادبی تقاریب کا انعقاد کرتے رہے ہیں اور ان کی محبت ہے کہ مجھے ہر تقریب میں بلاتے ہیں۔ وہ خود تو شاعر نہیں بلکہ پراپرٹی کے کاروبار سے وابستہ ہیں لیکن قدرت نے جب کسی شخص سے کوئی کام لینا ہو تو اُسے خود منتخب کر لیتی ہے۔ دوبئی میں پرنس اقبال کا وجود ادبی دنیا کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ ادبی محافل سجا کر اور شاعروں ادیبوں کی سیوا کر کے جو خوشی اُن کو حاصل ہوتی ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پرنس اقبال پاکستان سے بھی والہانہ محبت کرتے ہیں۔ یوں تو ایوانِ اقبال سارا سال ہی تقاریب کا انعقاد کرتا ہے مگر علامہ اقبال کے یومِ پیدائش، برسی، یومِ پاکستان اور ۱۴ اگست کے حوالے سے اُن کے پروگرام بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ 27 اگست کو ہونے والا جشنِ آزادی کا مشاعرہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ جس میں یو اے ای کے شعراء امجد اقبال امجد، حفیظ عامر اور کنول ملک کے علاوہ پاکستان سے سید سلیمان گیلانی، رخشندہ نوید اور خاکسار شامل تھا۔ مشاعرہ پاکستان کمیونٹی سنٹر شارجہ کے ہال میں ہوا۔ ہال کو اور اسٹیج کو خوبصورت پاکستانی پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ مشاعرے میں دوبئی، عجمان اور شارجہ سے کثیر تعداد میں کمیونٹی کے اہم افراد اور فیملیز نے شرکت کی۔ مشاعرے سے قبل جشنِ آزادی کیک کاٹا گیا جو کہ ہال میں موجود تقریباً 250 افراد میں تقسیم کیا گیا۔ مشاعرہ میں شعرا کی تعداد چونکہ کم تھی۔ اس لیے ہر شاعر سے جی بھر کے کلام سنا گیا اور سامعین سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے سنگم سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ مجھے حیرت ہوئی پرنس اقبال تن تنہا اتنے اچھے انتظامات کیسے کرتے ہیں۔ آخر میں شعراء میں تحائف تقسیم کیے گئے۔ رمادہ ہوٹل عجمان میں شعراء کے Stay کا انتظام تھا۔ پرنس اقبال نے روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مشاعرے سے اگلے روز شعراء کو دوبئی کی خوب سیر کرائی میں چونکہ ایک ہفتہ دوبئی رہا اس لیے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پرنس اقبال کے ساتھ خوب وقت گزرا۔ دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور میں خوب صورت یادیں سمیٹے یکم ستمبر کو امارات کی فلائٹ سے اوسلو روانہ ہو گیا۔ جہاں مجھے انور مسعود کی صدارت میں ہونے والے عالمی مشاعرہ میں 5 ستمبر کو شرکت کرنا تھی۔ اوسلو کا نام ذہن میں آتے ہی ارشد شاہین، جمشید مسرور، جواد شیخ، محمد اکمل اور ادریس لاہور یاد آتے ہیں۔ ارشد شاہین تو میرے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ لاہور میں ہم نے ایک ساتھ اپنی عملی زندگی اور ادبی کیریئر کا آغاز کیا۔ شب و روز اکٹھے گزارے مشاعروں میں شرکت کی۔ ادبی بحثوں میں حصہ لیا۔ بلاشبہ ارشد شاہین بہت اچھا انسان، بہترین دوست اور باکمال شاعر ہے۔ جواد شیخ سے سات برس قبل لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ خوبصورت نوجوان اور اُبھرتا ہوا شاعر۔ ان دنوں اُس کی غزلیں سُن کر اندازہ ہو گیا تھا کہ مستقبل میں اس نے بہت اعلیٰ شاعری کرنی ہے اور اب وہ اعلیٰ شاعری کر رہا ہے۔ محمد اکمل سے تعارف تو ارشد شاہین نے کرایا تھا۔ میری چند ملاقاتیں ہیں۔ اکمل جتنا اچھا کرکٹ کا کھلاڑی ہے اتنا ہی اچھا انسان اور دوست بھی۔ جمشید مسرور سے مل کر تو میں ہمیشہ مسرور ہوتا ہوں۔ ان کے باکمال شاعر ہونے میں تو ہرگز دو رائے نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت بھی بہت دل پذیر ہے۔ اس سے پہلے اوسلو کے تینوں مشاعروں میں میرے میزبان وہ تھے۔

ادریس لاہوری سے دو برس قبل اوسلو میں ہونے والے عالمی مشاعرہ میں مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ مگر یہ مختصر ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اس

میں ادریس کی محبت کا کمال زیادہ ہے۔ اوسلو میری آمد سے قبل اگرچہ ارشد شاہین نے میری طعام قیام کے تمام انتظام کر لیے تھے۔ مگر ادریس بھائی کی محبت نے اُن سے میزبانی کا حق چھین لیا۔ میں جب اوسلو ایئرپورٹ کے باہر آیا تو وہ ہاتھوں میں پھول لیے کھڑے تھے۔ باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ ادریس بھائی نے اتنے پُرتپاک انداز میں گلے لگایا کہ سفر کی ساری تھکن اُتر گئی۔ لاہور اور اوسلو کے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ عالمی مشاعرہ میں شرکت کے لیے اگلے روز برطانیہ سے جدید غزل کے نہایت منفرد شاعر اور بہترین دوست ضمیر طالب بھی اوسلو پہنچ گئے۔ اس بار تو ارشد شاہین، ضمیر طالب، جواد شیخ اور ادریس بھائی کے ساتھ خوب محفلیں جمیں۔ سیاحت بھی کی۔ (غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست) کے مصداق ڈاکٹر ندیم سے ملاقات بھی غنیمت تھی۔ بہت ہی نستعلیق شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی مصروفیت سے بہت سا وقت دیا اور اوسلو کی سیر کرائی۔ ادریس لاہوریے کا نام بار بار لینا اس لیے مجھے اچھا لگتا ہے کہ ان کے نام کے ساتھ لاہور جڑا ہے اور وہ لاہور کی طرح ہی سراپا دل ہیں۔ اپنے گھر انھوں نے اسلو اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے شعراء کو کھانے پر مدعو کیا جس میں جمشید مسرور، ارشد شاہین، جواد شیخ، ضمیر طالب، افتخار وڑائچ، ڈاکٹر ندیم، فیصل نواز چودھری اور خاکسار کے علاوہ کچھ اور احباب بھی موجود تھے۔ مشاعرے سے ایک روز قبل اوسلو سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ارشد شاہین اور جواد شیخ کے ساتھ ایک جزیرے کا سفر بھی یادگار رہا۔ راستے میں انتہائی خوبصورت لینڈ اسکیپ قابل دید تھے۔ اس جزیرے میں جواد کا پیزا پیلس کے نام سے بزنس اور رہائش ہے۔ ارشد شاہین اور جواد شیخ کے ساتھ رات بھر خوب محفل جمی۔ اوسلو کا مشاعرہ انور مسعود کی صدارت میں ہوا۔ تمام شعراء نے بھرپور کلام سنایا اور خوب داد وصول کی۔ میں اس سے قبل تین بار اوسلو کے عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکا ہوں۔ مگر سب سے زیادہ سامعین اس مشاعرے میں تھے۔ اوسلو سے میں بذریعہ بس ڈنمارک پہنچا جہاں کوپن ہیگن کے شعراء نے میرے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ میں تقریباً 5 برس قبل شعیب بن عزیز کے ہمراہ کوپن ہیگن آیا تھا۔ آج تنہا سفر کرتے ہوئے نئے مناظر کے ساتھ ساتھ پرانی یادیں بھی تازہ ہوتی گئیں۔ میں صبح کوپن ہیگن پہنچا تو کامران اقبال اعظم اپنی مخصوص دل نشیں مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔

انھوں نے وہاں ایک بٹ صاحب کے ہوٹل پہ نہاری اور پائے کا ناشتہ کرایا۔ لاہور میں رہنے اور ایک سے بڑھ کر ایک لذیذ کھانے کھانے کے باوجود میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں نے ایسی نہاری اور پائے نہیں کھائے۔ انھوں نے اپنے ہوٹل کا نام پاکستانی ریسٹورنٹ رکھا ہوا تھا۔ عموماً باہر کے ممالک میں پاکستانی ہوٹل مالکان ''پاکستانی انڈین ریسٹورنٹ'' لکھتے ہیں۔ اس سے دونوں ملکوں کے گاہک مل جاتے ہیں مگر بٹ صاحب نے کمال کیا ہوا تھا۔ کامران اقبال اعظم خوبصورت نوجوان اور دل پذیر شاعر ہیں۔ میں نے ان کا شعری مجموعہ ''اس کا وعدہ تھا کل شام'' شائع کیا ہوا ہے۔ صفدر علی آغا بھی آ گئے اور ہم کوپن ہیگن سے تقریباً 37 کلومیٹر دور ایک خوبصورت مقام پر چلے گئے جہاں ہمارے ایک اور بہترین دوست، منفرد شاعر اور کلاسیکل شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے فواد کرامت کا آفس تھا۔ وہ کارپٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ مجھے دنیا میں جو شہر پسند ہیں ان میں کوپن ہیگن بھی ہے۔ سٹی ہال، شاہی محلات، پرانے قلعے، گرجا گھر واکنگ اسٹریٹ عجائب گھر اور تووالی سب کچھ دیکھنے کے قابل ہے۔ اگلے روز شعری نشست میں محمد اقبال اختر سے بھی ملاقات ہوگئی۔ بہت سینئر شاعر اور شفیق دوست ہیں۔ ان کا وجود کوپن ہیگن میں کسی غنیمت سے کم نہیں۔ انڈین شاعر ابوطالب کے کلام نے بھی بہت متاثر کیا۔ دیارِ غیر میں کسی ایک شہر میں اتنے اچھے شعراء کا ہونا غیر معمولی بات ہے اس لیے میں جب یورپ جاؤں تو اچھی شاعری سننے کی خواہش مجھے کوپن ہیگن کی طرف کھینچتی ہے۔ مختصر شعری نشست کے بعد ڈنر اور پھر اگلے روز فرینکفرٹ کی طرف روانگی۔ کوپن ہیگن سے فرینکفرٹ تک ٹرین کا سفر بہت یادگار اور خوشگوار گزرا۔ جرمنی میں میری میزبان معروف شاعرہ شازیہ نورین تھیں۔ وہ طاہر عدیم اور مستجاب علی کے ساتھ اسٹیشن پر پھول لیے موجود تھیں۔ شازیہ نورین سے تو لاہور میں ملاقاتیں رہیں۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں کے دوران اس کا کلام سنا اور اس کا شعری مجموعہ بھی پڑھا ہوا تھا۔ وہ

ایک جینوئن اور اچھی شاعرہ ہیں۔ جرمنی میں طاہر عدیم کی شاعری سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اتنا خوبصورت، منفرد اور جدید شاعر، مجھے طاہر عدیم کی شاعری بہت منفرد لگی۔ شازیہ نورین ٹھیک کہتی تھی کہ طاہر عدیم انتہائی باکمال شاعر ہے۔ مستجاب علی اگرچہ شاعر تو نہیں تھے مگر بہت باذوق تھے۔ داد دینے کا انداز اس قدر خوبصورت کہ دل کرتا تھا ہم شعر سناتے جائیں اور وہ داد دیتے جائیں۔ عالمی مشاعرہ میں یورپ کے علاوہ انڈیا، کویت، امریکہ اور برطانیہ سے شعراء تشریف لائے ہوئے تھے۔ بطور مہمانِ اعزاز مجھے عزت بخشی گئی۔ محمد علی وفا (کویت)، جمیل موسوی (امریکہ)، راغب دہلوی (انڈیا) کے علاوہ پاکستان سے خصوصی طور پر تشریف لائے۔ مشہور اینکر سیّد بلال قطب اور معروف صحافی علی عباس نے بھی تصوف کے حوالے سے لیکچر دیے۔ اس مشاعرے کے میزبان ممتاز شاعر اقبال حیدر تھے۔ میں ان کی محبتوں کا شکر گزار ہوں۔ مشاعرے کے فوراً بعد مجھے اور شازیہ نورین کو بارسلونا (اسپین) جانا تھا جہاں میرے اعزاز میں قلم قافلہ والوں نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ مگر روانگی سے چند لمحے قبل شازیہ نورین کسی مجبوری کے باعث نہ جا سکیں۔ بارسلونا میں میرے بہت پیارے دوست اور خوب صورت شاعر ارشد نذیر ساحل اور بارسلونا کی ادبی اور صحافتی حوالے سے بہت مقبول شخصیت راجہ شفیق کیانی بس ٹرمینل پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ بارسلونا کے مشاعرے میں جرمنی سے طارق الیاس اور پرتگال سے مزاحیہ شاعر احمد سعید بھی آئے ہوئے تھے۔ راجہ شفیق کیانی نے مجھے اپنے گھر ٹھہرایا اور بارسلونا کی خوب سیر کرائی۔ بارسلونا میں تین برس قبل بھی آیا تھا اور اُس وقت میرے اعزاز میں قلم قافلہ نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ مگر اس بار جتنی شاندار تقریب اور مشاعرہ ہوا۔ یورپ میں اس سے پہلے میں نے اتنی اچھی تقریب نہیں دیکھی۔ اس تقریب کا عنوان تھا ''ایک شام حسن عباسی کے نام'' قطلونیا کے قومی دن کی وجہ سے چھٹی تھی۔ پورا بارسلونا خوبصورت پرچموں اور چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اسپین سے علیحدگی چاہتے ہیں۔ پاکستانی کمیونٹی کو بھی چھٹی تھی اس لیے توقع سے زیادہ افراد کی تقریباً 150 کے قریب لوگ تھے۔ سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور اہم کاروباری شخصیات نے شرکت کی۔ تمام اہم چینلز جیو، ایکسپریس، دُنیا، سما اور ریچ ٹی وی نے بھرپور کوریج کی۔ مقامی شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ حافظ احمد کی نظامت بھی خوب تھی۔ الیاس طارق اور احمد سعید نے بھی خوب رنگ جمایا۔ یہ تقریب تین تنظیموں قلم قافلہ، ریڈیو پاک سلونا اور ہم وطن اخبار کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ آخر میں جس محبت سے خاکسار کی شاعری سنی اور پسند کی گئی ان لمحات کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ تقریب کے بعد ہال میں موجود تمام لوگوں نے فرداً فرداً میرے ساتھ تصاویر بنوائیں۔ راجہ رفیق کیانی نے اعزازی شیلڈ پیش کی اور بعد میں ڈنر کا اہتمام تھا۔ یہاں پرانے دوستوں سعید قریشی اور حفیظ عباسی سے بھی ملاقات ہوئی۔ حفیظ عباسی نے میرے اعزاز میں ایک ڈنر کا بھی اہتمام کیا جس میں کمیونٹی کے اہم افراد نے شرکت کی۔ میں بارسلونا میں ارشد نذیر ساحل اور راجہ شفیق کیانی کی محبتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی محبتیں میں اپنے دامن میں سمیٹے اٹلی کے شہر میلان پہنچا جہاں میری میزبان ایک بار پھر شازیہ نورین تھی جو کہ فرینکفرٹ سے میلان پہنچ چکی تھی۔ پنجابی کے شاعر رضا شاہ اور طارق صاحب نے مجھے ریسیو کیا۔ میلان میں پہلی بار آیا تھا۔ میرے پاس صرف دو دن تھے کچھ سیر طارق صاحب اور شازیہ کے ساتھ کی۔ تقریب بھی خوب رہی۔ رضاہ شاہ نے نظامت کی۔ جبکہ صدارت وہاں کی معروف ادبی شخصیت جیم فے غوری نے کی۔ مہمان خاص خاکسار تھا۔ جبکہ مہمانِ اعزاز یورپ میں پی آئی اے کے ڈائریکٹر مظہر زرداری اور شازیہ نورین تھیں۔ بہت سے شعراء نے کلام سنایا۔ آخر میں مجھے بھی بہت شوق کے ساتھ سنا گیا۔ میلان کے شعراء کو سُن کر حاضرین کے ادبی ذوق کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کچھ نوجوانوں نے بھی خوب کلام سنایا۔ جن شعراء کے نام یاد رہ گئے ان میں افتخار گیلانی اور ملک نصیر کی شاعری نے خوب لطف دیا۔ اگلے دن میں وینس چلا گیا جس کو دیکھنا میرے دیرینہ سپنوں میں سے ایک تھا۔ وینس کا سارا سفر اور احوال انشاء اللہ اپنے یورپ کے سفرنامے میں تفصیل سے لکھوں گا۔ میلان سے امارات کی فلائٹ سے میں پہلے دبئی اور پھر لاہور واپس آ گیا۔ زندگی کی کتاب میں چند اور خوبصورت اور یادگار صفحات کا اضافہ ہو گیا۔

ارژنگ: نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال راہی: میرے خیال کے مطابق جو شاعر بحر اور وزن کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ اپنے لیے یہ میدان منتخب کر لیتا ہے۔ اس میں نہ ہینگ لگے اور نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آنے والی بات ہے۔

ارژنگ: ابتدائی دور میں کن کن شعرا کا مطالعہ کیا؟

اقبال راہی: مجھے بچپن ہی سے فانی، میر، داغ اور جگر پسند تھے۔ میں نے انھیں پڑھا اور اب تک اسی نوعیت کے دیگر اساتذہ میرے زیرِ مطالعہ ہیں۔

ارژنگ: اور موجودہ شاعروں میں کس سے متاثر ہیں؟

اقبال راہی: منیر نیازی اپنی طرز کے انوکھے شاعر تھے۔ جوش ملیح آبادی، احسان دانش، شکیب جلالی، ڈاکٹر خورشید رضوی، شہزاد احمد، حمیدہ شاہین، ادا جعفری، رخشندہ نوید، شاعری کے وہ مینار ہیں جن کی روشنی سے ادب جگمگا رہا ہے۔

ارژنگ: مطالعے کا رجحان کس حد تک قائم ہے؟

اقبال راہی: جب سے الیکٹرک میڈیا نے سر اُٹھایا ہے مطالعہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ بچے بڑے سب اس طرف راغب ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اب نئی کتابیں فٹ پاتھوں پر باآسانی دستیاب ہیں۔

ارژنگ: ترقی پذیر معاشرے میں ادیب کا کیا مقام ہے؟

اقبال راہی: یوں تو ادیب کا بڑا مقام ہے مگر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ نئی نسل تک منتقل نہیں ہو پا رہا۔ چند مخصوص ادیب ہیں جن کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ زندگی کے مسائل اس قدر ہولناک اور گمبھیر ہو گئے ہیں کہ عام آدمی کو روٹی کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ معاشرتی ناہمواری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ بے روزگاری اپنی آخری حد بھی پار کر گئی ہے۔ معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والی اُلجھن کا شکار ہے جس سے عدم تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے۔

ارژنگ: اب تک کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اقبال راہی: پہلا مجموعہ زندہ حروف مرحوم اختر کاشمیری نے توفیق بٹ کے کہنے پر شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ قطعات پر مشتمل تھا (جو میں روزنامہ اوصاف میں لکھتا رہا۔ اب بھی جاری ہے) ہائی الرٹ پاکستان تیسرا مجموعہ قطع برید حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ بھی کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق ہے کہ اس میں پروفیسر عاشق رحیل، حسن عباسی، میاں منظور شاہد، محمد جمیل خان، عبدالمجید چٹھہ اور سلیم اختر ملک کا تعاون حاصل ہے۔

ارژنگ: آپ کے گھریلو حالات ابتر ہیں کیا وجہ ہے؟

اقبال راہی: میری شادی 1973 میں ہوئی۔ گھر میں غربت کا راج تھا۔ روزگار نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے خواجہ محمد رفیق کے پریس میں کام کیا پھر بچوں کا رسالہ چندا ماموں میں چپراسی سے لے کر ایڈیٹر تک خود تھا۔ ماہنامہ قہقہہ میں مزاحیہ شاعری لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ جب قطعات کا سلسلہ شروع ہوا تو کوہستان، مغربی پاکستان، استقلال، سما، افلاک اور اب گزشتہ سال سالوں سے روزنامہ اوصاف میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ جس کا معاوضہ ندارد۔

ارژنگ: تنقیدی اجلاسوں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

اقبال راہی: حضور ہمارے زمانے میں تنقیدی اجلاس برائے اصلاح ہوا کرتے تھے۔ اب صرف تنقید برائے تنقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی گروپ ہیں جو اس محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں یا یوں کہیں کہ یہ شعبہ قبضہ گروپوں کے ہاتھ آ گیا ہے اور اس میں ہاتھ دکھانے والوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ارژنگ: پنجابی میں بھی کوئی کتاب آئی ہے؟

اقبال راہی: پنجابی میں شعر تو کافی لکھے ہیں جب محترم دلدار پرویز بھٹی زندہ تھے تو وہ اپنے پروگرام میں بلاتے تھے۔ وہاں ہم پنجابی نظمیں پڑھتے تھے۔ جن کی تعداد بھی اب سو کے قریب ہے۔ منظوم خراج کے عنوان سے ایک مجموعہ تیار ہے جو 150 نظموں پر مشتمل ہے جو مشاہیر مرحوم اور حاضر شعرا کے بارے میں کہی گئی تھیں لیکن کتابی صورت میں لانے کے لیے خدا جانے کتنے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں گے۔

ارژنگ: آپ کے ساتھ پے بہ پے حادثے ہوتے رہے اس کی مختصر تفصیل۔

اقبال راہی: ہمارا انیس سال کا بیٹا 1997 میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد جو تین بچے خون کی مہلک بیماری تھیلیسیمیا کا شکار تھے ان میں سے ایک بیٹی نیلم اقبال 8 سال قبل عید کے دوسرے دن اللہ کو پیاری ہو گئی۔ والد محترم ہمشیرہ کی شادی والے دن انتقال کر گئے۔ والدہ بھی کچھ ہی عرصے بعد دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر ہمیں روتا چھوڑ گئی۔ اب تازہ المیہ یہ کہ ہمارا شاعر بیٹا (مصنف لہو کا حصار) 15 دسمبر 1914 کو ایک ہفتہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد ہمیں لاکھوں برس کے غم دے گیا۔ اس کی وفات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بینائی کم ہو گئی اور بدن کمزوری سے اپنا رشتہ مستحکم کرنے پر تل گیا ہے۔

ارژنگ: آج کل آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

اقبال راہی: 2005 میں ضلعی حکومت کی ملازمت سے ریٹائر ہوا۔ ماہنامہ احوال لاہور میں ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی نے ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ ہر ماہ کسی شاعر یا شاعرہ کا کلام اس ماہ کا شاعر کے عنوان سے مہیا کریں۔ روزنامہ اوصاف میں روزانہ کی بنیاد پر ایک قطعہ تحریر کرتا ہوں۔ ایک ماہنامہ تارکین وطن ہے جو بیرون ملک ارسال کیا جاتا ہے اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوں اور گوشۂ ادب تحریر کرتا ہوں جس میں تقریبات کا احوال کتابوں پر تبصرے مختلف ادبی خبریں اور اساتذہ کا اردو پنجابی کلام شائع ہوتا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر میاں منظور شاہد ہیں جو بہت پیارے انسان اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔

ارژنگ: ارژنگ کے بارے میں کوئی رائے؟

اقبال راہی: یوں تو ادبی رسالے کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں لیکن بیشتر رسالوں کے مدیروں نے اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ عامر بن علی اور حسن عباسی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ یہ ارژنگ کے ذریعے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مضافات میں رہنے والے شاعروں کا کلام تواتر سے شائع ہوتا ہے اور یہ کسی کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

ادب کو زندگی کا ترجمان اور بامقصد ہونا چاہیے

بہت سے لوگ فطری طور پر ادیب ہوتے ہیں مگر ماحول میسر نہ آنے کے باعث اُن کے اندر کا ادیب اُن کے اندر وفات پا جاتا ہے

برطانیہ میں شروع سے ہی بہت شاندار ادبی ماحول رہا ہے

برطانیہ میں ممتاز شاعرہ، افسانہ نویس اور ناول نگار سعدیہ سیٹھی سے حسن عباسی کی گفتگو

سوال: ایک ادیب کا زندگی سے متعلق نظریہ عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کے مطابق زندگی کیا ہے؟

جواب: زندگی میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا مقصد رب کی حمد و ثنا اور عبادت کے بعد درست عقیدے کے ساتھ اسے بسر کرنا اور دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں میں کوئی ترقی پسند یا انقلابی فکر کی ادیبہ نہیں کہ زندگی کے نئے معانی تلاش کروں جو میرے والدین نے میری تربیت کی اور مجھے بتائے میری سوچ وہاں تک ہی محدود ہے۔

س: ادب سے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟

ج: میرا ادب سے متعلق بھی وہی نظریہ ہے جو زندگی سے متعلق ہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان اور بامقصد ہونا چاہیے۔ اگر اُس سے قاری کی تربیت نہیں ہوتی اور معاشرے میں مثبت تبدیلی نہیں آتی تو میرے نزدیک وہ غیر مفید ہے۔

س: کیا ادیب فطری طور پر ادیب ہوتا ہے یا حالات اور ماحول اُسے ادیب بناتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں دونوں عوامل کارفرما ہوتے ہیں فطری طور پر کسی شخص کا ادیب ہونا پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ اُس کے بعد حالات اور ماحول کا بڑا عمل دخل ہے۔ بہت سے لوگ فطری طور پر شاعر، ادیب ہوتے ہیں۔ مگر ماحول میسر نہ آنے کے باعث اُن کے اندر کا ادیب اُن کے اندر ہی وفات پا جاتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں ہمارے ہاں کبھی کبھار کوئی شاعر یا ادیب خود کو اپنی نصف یا اس سے زیادہ زندگی گزار لینے کے بعد دریافت کرتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اُس کو ماحول تب میسر آتا ہے۔ اگر انسان کے اندر فطری صلاحیت نہ ہو تو ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ ادیب نہیں بن پاتا۔ ورنہ یونیورسٹیوں کے تمام پروفیسر ادیب ضرور ہوتے ہیں۔

س: آپ نے مختلف اصناف ادب میں کام کیا ہے افسانے لکھے، شاعری کی۔ ناول لکھا اب اس کے علاوہ بھی کسی صنف میں کام کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: میں بنیادی طور پر تو خود کو شاعرہ ہی سمجھتی ہوں۔ شاعری میں جب طبیعت رواں نہ ہو تو میں نثر لکھتی ہوں۔ زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا رُجحان تصوف اور مذہب کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ میرا اگلا شعری مجموعہ انشاء اللہ نعتیہ ہوگا جس میں حمد، سلام بھی ہوں گے۔ اس حوالے سے میں کام کر رہی ہوں اور میری یہ خواہش بھی ہے کہ یہ مجموعہ میری زندگی میں شائع ہو۔

س: آپ طویل عرصہ سے برطانیہ میں مقیم ہیں تو وہاں کا ادبی ماحول کیسے ہے اور ادب کے حوالے سے کیا کام ہو رہا ہے۔

ج: آپ کی یہ بات درست ہے کہ میں طویل عرصہ سے برطانیہ میں مقیم ہوں مگر میرا مزاج ایسا ہے کہ میں ادبی تقریبات میں بہت کم شرکت کرتی ہوں۔ ہاں البتہ مجھے یہ علم ہوتا ہے کہ وہاں کون کیا تخلیق کر رہا ہے۔ برطانیہ میں شروع سے ہی بہت شاندار ادبی ماحول رہا ہے۔ مشاعروں کا اہتمام باقاعدگی سے رہا۔ بڑے بڑے شاعر یہاں موجود ہیں نثر بھی اچھی لکھی جا رہی ہے۔ میں ایک ٹی وی چینل پر اسلامی اور ادبی پروگرام کرتی ہوں جسے بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

س: وطن سے دوری کا احساس کیسا ہے؟

ج: وطن سے دوری کا احساس بہت جان لیوا ہے۔ اس لیے میرے اشعار کا اکثر یہ موضوع ہوتا ہے۔ میں وہاں ایک مجبوری کے تحت قیام پذیر ہوں۔ گھرداری کے سبب اگر اختیار میں ہو تو میں اپنے سوہنے پاکستان میں رہوں۔ یہاں رہ کر مجھے روحانی سکون ملتا ہے۔

س: آخر میں قارئین کے لیے کوئی پیغام اور کچھ شاعری ہو جائے۔

ج: میرا پیغام یہی ہے کہ تمام مذاہب اور مسالک کی کھلے ذہن سے قدر کریں۔ ادب کو مثبت بنائیں۔ زمین کا بوجھ ہلکا کریں اور اس زمین کو امن کا گہوارہ بنائیں۔ اک غزل قارئین کی نذر

زمیں کل بھی یہیں ہوگی یہیں پر آسماں ہوگا
نجانے میں کہاں ہوں گی نجانے وہ کہاں ہوگا
تمہارے ساتھ ہر منظر ابھی تو صاف دکھتا ہے
تمہارے بعد میں جس سمت جاؤں گی دھواں ہوگا
ہزاروں امتحاں اس زندگی میں ہو چکے میرے
تو کیا مرنے کے بعد اب پھر نیا اک امتحاں ہوگا
مجھے تو آزما کے دیکھ لینا ہر عدالت میں
وہی میرا بیاں ہوگا کہ جو تیرا بیاں ہوگا
تمہیں سوچا ہے میں نے اس قدر کہ ایسا لگتا ہے
لگے گا زخم تم کو گر کوئی مجھ پر نشاں ہوگا
اگر دو چار دن میں رُک گئی تو دیکھ لینا تم
کہ اس جنگل کا ہر اک پیڑ میرا ہم زباں ہوگا
نجانے سعدیہ بدلیں گے اپنے روز و شب کیسے
نجانے کب مقدر کا ستارہ مہرباں ہوگا

شاعری (غزل، نظم)

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں
میں تیری سمت مگر مستقل سفر میں ہوں
نجانے اگلی گھڑی کیا سے کیا میں بن جاؤں
ابھی تو چاک پہ ہوں دست کوزہ گر میں ہوں
میں اپنے فکر کی تجسیم کس طرح سے کروں
بریدہ دست ہوں اور شہر بے ہنر میں ہوں
نجانے کون سا موسم مجھے ہرا کر دے
نمو کے واسطے بے تاب ہوں، شجر میں ہوں
یہ دوستی بھی عجب چوب خشک ہے ناصر
نبھا رہا ہوں مگر لوٹنے کے ڈر میں ہوں

ناصر علی سید/ پشاور

اک عجب کیفیتِ ہوش ربا طاری تھی
قریۂ جاں میں کسی جشن کی تیاری تھی
سر جھکائے ہوئے مقتل میں کھڑے تھے جلاد
تختۂ دار پہ لٹکی ہوئی خودداری تھی
خون ہی خون تھا دربار کی دیواروں پہ
قابضِ تختِ وراثت کی ریاکاری تھی
ایک ساعت جو تری زُلف کے سائے میں کٹی
ہجر بردوش زمانوں سے کہیں بھاری تھی
اور سب ٹھیک تھا بس ہم سے بھلائی نہ گئی
تیرے خاموش رویے میں جو بے زاری تھی
اک قیامت تھی کہ رُسوا سرِ بازار تھے ہم
اور پھر اس کی وہ تشویش بھی بازاری تھی
تیرے محکوم ترے حاشیہ برداروں کی
صرف وردی ہی نہیں سوچ بھی سرکاری تھی

سرور ارمان/ نارووال

قفس ہے جو برنگِ سائباں رکھا ہوا ہے
ہمارے سر پہ یہ جو آسماں رکھا ہوا ہے
تری آنکھوں میں کیوں چھلکا نہیں رنگِ تمنا؟
ترے سینے میں دل کیا رائگاں رکھا ہوا ہے
یہ کوئی روشنی سی ہے مرے آفاقِ فن پر
اور اس نے بھی مجھے کچھ خوش گماں رکھا ہوا ہے
وہی دکھلا رہا ہے ہم کو دو آنکھوں سے دُنیا
اسی نے ہم کو ہم سے بھی نہاں رکھا ہوا ہے
یہی تو ہے دلیل اس کی اماں بخشی کی رحمان
کہ اس نے ہم کو اب تک بے اماں رکھا ہوا ہے

رحمان حفیظ/ اسلام آباد

اک بغاوت سی رویوں سے عیاں ہوتی ہے
زندگی تیغ سے تسخیر کہاں ہوتی ہے
جبر کی رُت ہی مزاجوں کو بدل دیتی
حرب کی خو بھی غلامی میں نہاں ہوتی ہے
رات کے کھوئے مسافر کو، وہ شعلے کی لپک
دشت میں دور سے ہستی کا نشاں ہوتی ہے
اے زمیں زادو! ذرا درد زمیں کے جانو
اپنے ہر وار سے زخمی تو یہ ماں ہوتی ہے
اس زمانے کی فصیلوں میں دراڑیں نہ پڑیں
ورنہ تاریخ بھی عبرت کا نشاں ہوتی ہے
کتنے جسموں کی تھکن تیرے خزانے میں ہے، سوچ
زندگی کیسے بسر تیری میاں ہوتی ہے
جب کسی دھوپ نگر پر کوئی چھا جائے سحاب
زندگی چھاؤں کی اک رقص کناں ہوتی ہے

اسلم سحاب ہاشمی/ ساہیوال

دل تجھے دیکھ کے مہمان ہوا چاہتا ہے
میری رُسوائی کا سامان ہوا چاہتا ہے
تم جو آئے ہو مرے پاس تو یوں لگتا ہے
پورا منظر ہی دل و جان ہوا چاہتا ہے
روگ یہ ہجر کا پہلے تو بہت کم کم تھا
اب یہی زیست کا عنوان ہوا چاہتا ہے
ہر خوشی بن کے جو اُترا تھا کبھی آنگن میں
اب وہی عشق پریشان ہوا چاہتا ہے
جب سے آیا ہے ترے دل میں اُترنے کا گمان
اس پہ ہر شخص نگہبان ہوا چاہتا ہے
جس کی قربت میں بھلایا تھا زمانے بھر کو
مجھ سے وہ شخص بھی انجان ہوا چاہتا ہے
کتنا صدمہ ہے فضاؤں میں ترے جانے سے
شہر کا شہر ہی سنسان ہوا چاہتا ہے
جب سے کچھ زخم لگے ہیں مرے دل پر انجم
ہر کفِ یار نمک دان ہوا چاہتا ہے

فاخرہ انجم/ لاہور

میں جب آنسو بہاؤں گا
تو سب کچھ دیکھ پاؤں گا
محبت ہوں محبت سے
میں خود کو بانٹ جاؤں گا
اُسے میں نے رُلایا ہے
اُسے میں ہی مناؤں گا
جو میرے دل میں رہتا ہے
اب اُس کو دُکھ سناؤں گا
مجھے روکا تھا تاروں نے
میں چندا کو بتاؤں گا
اُسے کانٹے بچھانے دو
میں پلکوں سے اُٹھاؤں گا
میں جادو سیکھتے ہی شمس
اُسے سب سے چھپاؤں گا

شمس ملتانی/ملتان

یہ زمیں چپ ہے آسماں خاموش
میں بھی ہوں ان کے درمیاں خاموش
اُس کو "ہاں" ہی سمجھ لیا سب نے
میں تو انکار میں تھی ہاں خاموش
مجھ کو حالات نے کیا مجبور
رہنے والی تھی میں کہاں خاموش
بولنا چاہیے جہاں اُن کو
لوگ ہو جاتے ہیں وہاں خاموش

میری آنکھوں میں بارشیں ہیں مگر
میرے اندر ہیں بجلیاں خاموش
جس کی اولاد اُس سے چھن جائے
کیسے رہ سکتی ہے وہ ماں خاموش
یہ ہے دربار عشق صاحب کا
اے ستارہ رہو یہاں خاموش

شکیلہ ستارہ/واہ کینٹ

وہ عالم تشنگی کا ہے سفر آساں نہیں لگتا
بظاہر تو مجھے بارش کا بھی امکاں نہیں لگتا
یہ دل جاگیر ہے جس کی اسی کے نام کر دی ہے
جو میرے دل کے آنگن میں مجھے مہماں نہیں لگتا
شعور و آگہی کیسی کوئی وحشی کوئی سرکش
یہ کیسا دیس ہے یارو کوئی انساں نہیں لگتا
نئی قدریں نئی تہذیب کا آغاز ہوتی ہیں
ادب کا گلستاں ہرگز کبھی ویراں نہیں لگتا
نہ ہو محفوظ مال و زر نہ عزت آبرو ہی جب
تو پھر زندہ کسی کا بھی مجھے ایماں نہیں لگتا
کہاں کا فخر کیسا ناز من آنم کہ من دانم
مگر جو رب سے پایا ہے مجھے ارزاں نہیں لگتا
خدا رکھے سہیلہ ہر گھڑی ماں باپ کا سایا
دُعا سے جن کی طوفاں بھی مجھے طوفاں نہیں لگتا

سہیلہ انعام صدیقی/کراچی

جگنو، ستارے، تتلیاں لایا کروں گا میں
اے جھیل! تیرا حسن بڑھایا کروں گا میں
شہزادی تیرا جوڑا سجانے کے واسطے
گلشن سے پھول توڑ کے لایا کروں گا میں
عذرا! میں جا رہا ہوں ترا شہر چھوڑ کر
لیکن کبھی کبھار تو آیا کروں گا میں
عمران ہے، نہ تو ہے، نہ کالج کی لڑکیاں
اب کس کو اپنے شعر سنایا کروں گا میں
ہوں افتخار میں بھی کسی پیڑ کی طرح
اپنے علاوہ سب پہ ہی سایا کروں گا میں

افتخار شعر/اوکاڑہ

موسموں سا حبیب

خزاں کا چاند تھا
وہ پھول اک بہار کا تھا
وہ دل کے صحرا میں بارش کی طرح آیا تھا
کہ تپتی زیست میں گری وہ لمس کی لایا
پگھل گیا تھا بدن
اور بدن کے ساتھ جگر
سماں عجب تھا بہت اسکی رخصتی کا مگر
بہت ہی سرد تھا اس کے مزاج کا موسم
جو چھوڑ کر گیا بستی کسی اندھیرے میں
وہ آفتاب تھا پربت کی اوٹ میں چھپتا

عامر بن علی/جاپان

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

لاہور ادبی فارم کا عالمی مشاعرہ

گزشتہ دنوں لاہور ادبی فورم کے زیرِ اہتمام ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت عطاء الحق قاسمی نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر خورشید رضوی اور امجد اسلام امجد مہمانانِ خصوصی تھے۔ بیرونِ ملک سے آئے ہوئے شعراء مہمانانِ اعزاز میں شامل تھے جن میں شازیہ نورین (جرمنی)، قمر ریاض (مسقط)، ارشد نذیر ساحل (اسپین) اور نوید انور (دبئی) سے تشریف لائے تھے۔ مشاعرے میں ملک اور بیرونِ ملک سے نامور شخصیات نے شرکت کی۔ مشاعرے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نامور شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے اور اپنے تازہ شعری مجموعے ''سائیں'' سے حمد سنا کر مشاعرے کا پرجوش انداز میں آغاز کیا۔ لاہور ادبی فورم کے چیئرمین افتخار شوکت چودھری نے خطبہ استقبالیہ میں مہمان شعراء کا شکریہ ادا کیا اور عالمی مشاعرے میں سنائی جانے والی شاعری کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر خورشید رضوی، امجد اسلام امجد، شازیہ نورین، قمر ریاض، ارشد نذیر ساحل، نوید انور، باقی احمد پوری، غلام حسین ساجد، سید سلیمان گیلانی، بیگم نشو (اداکارہ)، قمر رضا شہزاد (ملتان)، شاہین عباس (شیخوپورہ)، علی یاسر (اسلام آباد)، عدیل برکی (نامور نگر)، ڈاکٹر ضیاالحسن، حمیدہ شاہین، صوفیہ بیدار، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، زاہد شمسی، افتخار شوکت چوہدری اور زاہد محمود شمس نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے میں شعراء نے بہت خوبصورت شاعری سنائی۔ حاضرین نے ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔ مشاعرے کے آخر میں پرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کوثر محمود کی وطن واپسی

ممتاز شاعر، محقق اور مترجم ڈاکٹر کوثر محمود دبئی، ترکی اور ایران کے دورے سے وطن واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان ممالک کے سفر کا احوال وہ آج کل قلمبند کر رہے ہیں۔ اُمید ہے ان کا یہ سفرنامہ جلد منظرِ عام پر آئے گا۔

عامر بن علی کی جاپان واپسی

ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیرِ اعلیٰ عامر بن علی پاکستان کے مختصر دورے کے بعد جاپان واپس چلے گئے ہیں۔ یہاں قیام کے دوران انھوں نے نامور ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کے علاوہ مختلف ادبی تقاریب میں شرکت کی۔ ممتاز شاعر ممتاز راشد لاہوری نے ان کے اعزاز میں اکیڈمی ادبیات میں ایک ظہرانے کا اہتمام بھی کیا جس میں شازیہ نورین (جرمنی)، محمد جمیل ڈپٹی ڈائریکٹر اکیڈمی ادبیات اور راجا نیر نے شرکت کی۔ حسن عباسی اور راجا نیر نے عامر بن علی کے حوالے سے گفتگو کی اور آخر میں اُن سے اور شازیہ نورین سے کلام سنا گیا۔

محمد اظہار الحق کے اعزاز میں عشائیہ

ممتاز شاعر شعیب بن عزیز اسلام آباد سے تشریف لائے جدید نظم و غزل کے منفرد شاعر اظہار الحق کے اعزاز میں G.O.R میں ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ صدارت ظفر اقبال نے کی۔ تقریب میں اصغر ندیم سید، سعود عثمانی، حسن عباسی، ندیم بھابھہ نے شرکت کی۔ اصغر ندیم سید نے اظہار الحق کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس موقع پر محمد اظہار الحق سے ان کا کلام بھی سنا گیا۔

مظہر کلیار کا مقالہ

مظہر کلیار کا تنقیدی مقالہ ''عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ KPK سے منظور ہو گیا ہے ادارہ ارژنگ کی طرف سے ان کو مبارکباد

کتاب ورثہ

کتاب دوست شخصیت مظہر سلیم مجوکہ نے ''کتاب ورثہ'' کے نام سے اُردو بازار میں پبلشنگ کا ادارہ قائم کر لیا ہے۔

ہائی کورٹ میں مشاعرہ

ملک سلیم اختر اور نرگس ناہید (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ) نے ہائی کورٹ کے آڈیٹوریم میں جرمنی سے آئی ہوئی شاعرہ شازیہ نورین کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی۔ مشاعرے میں ناصر بشیر، حسن عباسی، فوزیہ تبسم، فاخرہ انجم، نائلہ انجم، یوسف مثالی اور وکلاء شعراء نے شرکت کی۔ ہال میں وکلا کی کثیر تعداد کے علاوہ مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے شعراء نے شرکت کی۔

مختصر ادبی خبریں

☆ پنجابی زبان کے مایہ ناز سکالر محقق پروفیسر علامہ شریف صابر قضاالٰہی سے انتقال فرما گئے۔

☆ ڈونگا بونگا (بہاول نگر) میں مقیم اُردو، پنجابی کے شاعر ومضمون نگار ''گل زیب عباسی'' کا مجموعہ ''درِ فصیل'' مکتبہ فجر کے تحت شائع ہوگیا ہے۔

☆ اُردو انگریزی کے پروفیسر ''احسن رضا بھٹی'' کا پنجابی مجموعہ ''ڈونگھیاں سوچاں'' ادارہ مکتبہ فجر کے تحت شائع ہوگیا ہے۔

☆ کویت کے معروف شاعر بدر سیماب عید کی چھٹیاں گزار کر بخیریت واپس کویت تشریف لے گئے۔

☆ صدر گوگیرہ ضلع اوکاڑا کے معروف شاعر حکیم صوفی اللہ دتہ عاصی کا مجموعہ ''قطرہ نیساں'' چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔

شاعر، افسانہ نگار اور ادیب ایز دعزیز کی کتاب ''تسلیم'' شائع ہوگئی

ساہیوال میں مقیم معروف ادیب و شاعر ایزد عزیز کا شعری مجموعہ مودت و عقیدت ''تسلیم'' شائع ہوگیا ہے۔ اس میں گل ہائے نعت و سلام، نظمیں، مرثیہ، قطعات اور رباعیات عقیدت آثار شامل ہیں۔ یہ مجموعہ محمد اختر خان نے انور سنز پبلشرز ساہیوال سے شائع کیا ہے۔ کتاب کے حوالے سے معروف شاعر اور نقاد واصف سجاد یوں رقم طراز ہیں ''ایزد عزیز اردو، پنجابی شعر و ادب کی دنیا میں ایک معروف نام ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کا بنظر غائر جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ ایزد عزیز کے پیش نظر ہمیشہ اعلیٰ انسانی قدروں، آدرشوں اور ارفع جذبوں کی ترویج رہی ہے۔''

محترم والد چودھری برکت علی بانی ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی یاد میں

مجھے فخر ہے میں چودھری برکت علی پنجاب بکڈپو ماہنامہ 'ادب لطیف' مکتبہ اُردو اور مسلم ماڈل ہائی سکول اُردو بازار کا بیٹا ہوں۔ محترم والد چودھری برکت علی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ مقابلے کے امتحان کی تیاری مکمل تھی لیکن بانی پاکستان قائداعظم کے فرمان پر تحریک پاکستان کے حصول کی جنگ میں شرکت کرنے کی وجہ سے ملک و قوم کے لیے اس امتحان کی قربانی دے دی۔ انہوں نے کوئی سرکاری ملازمت کرنے کی بجائے تجارت کو ترجیح دی اور اس میں بھی اشاعتی شعبہ کو منتخب کیا۔

محترم والد چودھری برکت علی صاحب نے 1929ء میں پنجاب بک ڈپو اور 1935 ماہنامہ ''ادب لطیف'' اور مکتبہ اُردو قائم کیے۔ ماہنامہ ادب لطیف کی ادارت میری بہن صدیقہ بیگم انجام دے رہی ہے۔ معاونت بھائی چودھری ظفر علی۔ اللہ تعالیٰ بہن صدیقہ بیگم کو صحت یاب رکھیں۔ آمین

میں نے 1960 میں اپنا اشاعتی ادارہ چودھری اکیڈمی قائم کیا اور قدیم ادارے پنجاب بک ڈپو کی ذمہ داریاں میرے پاس ہیں۔ میرے ساتھ میرا بیٹا چودھری محمد طارق آبائی کام میں میرے ساتھ ہے۔ معیاری ادبی کتب کی اشاعت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ مکتبہ اُردو کو بھائی چودھری اکبر علی چلا رہا ہے۔ محترم والد چودھری برکت علی 8 اگست 1952 کو پچاس سال کی عمر میں اس جہان فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ مگر ملک اور قوم کے لیے جو خدمات انہوں نے انجام دی ہیں انشاء اللہ وہ ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے۔ وہ ادب اور ادیبوں کے بڑے قدردان تھے اور ادیبوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کو اپنا بھائی خیال کرتے تھے۔ ہر طریقے سے ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ غریب مسلمان طلباء کو فری کتابیں اور کپڑے دیتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے متعدد سکول بنوائے اور سکولوں کی تعمیر کے لیے چندہ بھی دل کھول کر دیتے تھے۔ جناب چودھری برکت علی نے اسی بات کی کوشش کی ان کے خاندان کے نوجوان اور مسلم قوم کے جوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر

کے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ وہ مسلم قوم کے جوانوں کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے۔ مجھے اپنے قابل فخر محترم والد چودھری برکت علی کے ساتھ زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر اس کے باوجود یادوں کے چراغ اب بھی دل و دماغ میں روشن ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں سکول سے چھٹی کر کے پنجاب بک ڈپو پر آ جاتا تھا۔ چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ پنجاب بک ڈپو اور ماہ ادب لطیف ادیبوں کا مرکز ہوتا تھا۔ اسی عرصہ میں میری پہلی ملاقات مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے ہوئی۔ وہ دوکان پر آئے تو والد صاحب ان سے کھڑے ہوکر بڑی گرم جوشی سے ملے۔

❀❀❀

ناروے میں مقیم نوجوان نسل کے منفرد شاعر جواد شیخ کا اولین مجموعہ

''کوئی کوئی بات'' اشاعت کے آخری مراحل میں

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔ 0300-4489310

مزاح راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ و نکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ ''علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی مدد معاون

قریباً 5 صد صفحات قیمت: 700 روپے

چولستان تاریخ و ثقافت

چولستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم و رواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

شاہد بیگ (ایڈووکیٹ) کے تین شعری مجموعوں

میری فکر میرا جہاں

میزانِ خرد و جنوں

اور

اورنگِ خیال

کے تازہ ایڈیشن اشاعت کے مراحل میں

اہتمام

نستعلیق مطبوعات، لاہور

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمراء: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: قطرۂ نیساں/شاعر: صوفی اللہ دتہ عاصی/صفحات: 272 / قیمت: 500 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: الحسینی پبلشرز، بستی روشن آباد، صدر گوگیرہ ضلع اوکاڑا

جیسا کہ مانا جاتا ہے کہ شاعری سراسر آمد کی مرہونِ منت ہے اور یہ بھی طے ہے کہ اس میں تعلیمی قابلیت کا کوئی عمل دخل نہیں۔ صاحبِ علم ہو تو آمد سونے پہ سہاگا کا کام دیتی ہے۔ صوفی اللہ دتہ اپنے وقت کے جید شاعر، باکمال اقبال دائم اقبال کے روحانی شاگرد ہیں۔ ان کے کلام میں اپنے استاد کا رنگ ہی نہیں جھلکتا بلکہ ان کے کلام پر گہرا اثر بھی ہے۔ صوفی صاحب نے اس مجموعہ میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری بھی ایک ساتھ قارئین کو پڑھنے کے لیے دی ہے۔ دو زبانوں کا یکجا ہونا قارئین کو دو آتشہ کا نشہ مہیا کرتا نظر آتا ہے۔ شاعری اُردو یا پنجابی دونوں میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہات استعارے قوافی منفرد انداز میں استعمال کر کے صوفی صاحب نے اپنے صاحبِ علم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے شائقین ادب اس قطرۂ نیساں سے ضرور فیض یاب ہوں گے۔

نام کتاب: ڈونگھیاں سوچاں/شاعر: احسن رضا/صفحات: 128 / قیمت: 30 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: فجر پبلی کیشنز، 15/6 فضل سٹریٹ چچ پیر روڈ نیو فرنگ

نوجوان شاعر احسن رضا کا تیسرا مجموعہ ڈونگھیاں سوچاں احسن رضا کی اپنی ماں بولی کے ساتھ والہانہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سے قبل دو مجموعے قارئین ادب سے پسندیدگی کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ احسن رضا بنیادی طور پر انگلش زبان کے پروفیسر ہیں لیکن اپنی شاعری میں ٹھیٹھ پنجابی الفاظ کو استعمال کر کے اپنے پنجابی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے پنجابی شاعری میں اپنا نام اولین سطروں میں لکھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جہاں احسن رضا نے آسان اور ٹھیٹھ پنجابی الفاظوں کا استعمال کیا ہے۔ وہاں نئے مضامین میں اضافہ و دیگر اصناف وتراکیب میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے پنجابی حلقے میں ان کے مجموعہ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

نام کتاب: طیبہ دے نورانی جلوے/شاعر: عالم لاہوری/صفحات: 208 / ہدیہ: 300 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: عدن بک ڈپو، گلستان کالونی، بخاری سٹریٹ قینچی امرسدھو، لاہور

مذکورہ مجموعہ حمدیہ، نعتیہ اور مناجات پر مشتمل ہے۔ عالم لاہوری المعروف بابا عالم نعت گوئی میں خاصا مقام رکھتے ہیں۔ اس سے قبل نعتیہ مجموعہ پر وزارت اوقاف پنجاب سے سیرت ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پیرانہ سالی خرابی صحت اور تنگی مالی حالت کے باوجود اس مجموعہ کو قابل اشاعت بنانا بابا عالم کا کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ حمد اور نعت و مناجات میں ان سب سے دلی وابستگی ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے اس مجموعہ کو بھی عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

نام کتاب: دردی آغوش/شاعر: رفیق کشمیری/صفحات: 160 / ہدیہ: 250 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: البکام پبلشرز، فیصل پلازہ، دیپال پور روڈ اوکاڑا

رفیق کشمیری حال مقیم اوکاڑا کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مذکورہ مجموعہ ان کا چودھواں (۱۴) مجموعہ ہے جن میں پانچ مجموعے پنجابی زبان سے تعلق رکھتے ہوئے شائقین ادب سے خراج تحسین پا چکے ہیں۔ حال ہی میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب شہباز شریف نے بھی ان کی شاعری سے متاثر ہو کر اپنی پسندیدگی کا اظہار رفیق کشمیری کو

خط لکھ کر کر چکے ہیں۔ بلاشبہ رفیق کشمیری قومی و پنجابی زبان دونوں سے برابر اپنی وابستگی اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بلا کی موسیقیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا موسیقی سے لگاؤ اور پیانو پر روزانہ مشق بھی ان کی شاعری میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ ان کی اکثر غزلیں خاصی طویل ہوتی ہیں۔ وطن سے وابستگی اور دین سے عشق کی حد تک لگاؤ ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ مشکل قوافی سے پرہیز کرتے ہوئے عام فہم الفاظ کا استعمال ان کا پسندیدہ عمل ہے۔ مجھے اُمید ہے یہ مجموعہ "درد کی آغوش" بھی صاحب ذوق و شاعر برادری میں سابقہ مجموعات کی طرح سب کو بھائے گا۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ رفیق کشمیری اپنا سفر یونہی جاری و ساری رکھیں گے۔

نام کتاب: المدینہ/ مصنف: فقیر اللہ خاں/ صفحات: 576 / تبصرہ نگار: صاحب زادہ حافظ محمود الرشید قدوسی

ناشر: مکتبہ اسلامیہ، ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

نبی کریم ﷺ سے محبت اور عقیدت کے اظہار کے لیے اہل ایمان نے مختلف طریقے آزمائے ہیں۔ کسی نے عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر نعت لکھی تو کسی نے سیرت رسول ﷺ کی شکل میں حیاتِ مبارکہ کے کچھ اوراق پلٹ ڈالے۔ کسی نے حضور ﷺ کی سنت کو جزوِ ایمان و عمل بنالیا تو کوئی مسجد نبوی میں روضہ رسول کی جالیوں سے لپٹ کر روتا رہا۔ حضرت محمد ﷺ کی ذات سے محبت اور عقیدت ہم سب مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ اسی لیے حرم پاک اور مکہ مکرمہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے متبرک جگہیں روضہ رسول ﷺ، مسجد نبوی ﷺ اور مدینہ منورہ ہیں۔

مدینہ کا قدیم نام یثرب تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی یہاں آمد کے بعد یہ شہر مدینۃ النبی کہلایا اور بعد میں مدینہ ہی کے نام سے معروف ہو گیا۔ مدینہ، نبی ﷺ کا شہر ہے۔ مکہ سے ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے مدینہ کو شرف بخشا تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہیں دنیا کی پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ یہیں حضور ﷺ وصال کے بعد بھی تہہ خاک قیام فرما ہیں۔ جنت البقیع میں گلشن رسول ﷺ کے کتنے ہی پھول خوابیدہ ہیں۔ احد کی طرف چلے جائیں تو شہدا کے مدفن ملیں گے۔ یہاں مسجد قبا بھی ہے اور مسجد قبلتین بھی۔ سلع پہاڑ کے دامن میں کھودی گئی خندق کی نشانیاں اب وہاں تعمیر شدہ چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں۔ کسی کو تلاش کرنے پر بیئر رومہ بھی مل سکتا ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں دیارِ مصطفیٰ کی مہک موجود ہے۔

فقیر اللہ خاں صاحب کی نبی کریم ﷺ سے محبت نے اپنے اظہار کی راہ "المدینہ" کی صورت میں نکالی ہے۔ خاں صاحب اس سے قبل دو سفرنامے بعنوان "امریکہ جیسے میں نے دیکھا" اور "سیر جہاں" قارئین کی نذر کر چکے ہیں لیکن مزاج کے اعتبار سے "المدینہ" بالکل مختلف کتاب ہے۔ اس میں ایک عشق و سرمستی کی کیفیت بھی ہے اور عقل شعور کے رنگ بھی۔ دیوانگی بھی جھلکتی ہے اور فرزانگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ معلومات کا خزانہ بھی ہے اور مصنف کے تخیل کی پرواز بھی۔ فقیر اللہ خاں نبی ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کے تقاضوں سے خوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب پختہ اور قلم واقفِ آدابِ عظمتِ رسول ﷺ ہے۔ "المدینہ" محض مدینہ منورہ کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس میں سیرت مبارکہ کے نقوش، اسلامی تاریخ کے کچھ اوراق اور اصحاب رسول ﷺ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مصنف نے ایک گائیڈ کی طرح مقامات مقدسہ کی سیر بھی کروائی ہے اور جدید مدینہ کے خدوخال بھی اُجاگر کیے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ فقیر اللہ خاں صاحب کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین

نام کتاب: تسلیم/ شاعر: ایزد عزیز/ صفحات: 112 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: واصف سجاد

ناشر: انور سنز پبلی شرز

ایزد عزیز کے شعری سفر کی تازہ ترین منزل "تسلیم" اس کائنات کی ایسی ہی عظیم المرتبت شخصیات سے محبت و مودّت کا آئینہ ہے۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کی معرفت ہی معرفتِ خداوندی، فکر و نظر کی سربلندی اور انسانیت کی آبرومندی ہے۔ "تسلیم" نعت، سلام، مرثیہ، رباعیات اور نظموں کے عنوانات میں منقسم ہے۔ صنفی اعتبار سے ان عنوانات کی حد بندی ممکن ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے یہ سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے دُرہائے آبدار محسوس ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے انسانیت پر بے شمار و ان گنت احسانات میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنی پہچان کے لیے ایسا گھرانا تخلیق کیا جس کا ہر فرد بے مثال و انسانیت کا نقطہ کمال نظر آتا ہے اور جب تخلیقی اور زرخیز ذہن اُن کی محبت سے مالا مال ہو تو فن کار کا فن لازوال ہو جاتا ہے۔ یہی اس ذکر کا اعجاز ہے جو "تسلیم" کے ہر لفظ کا اعزاز ہے۔

نام کتاب: خوشبوئے آ گہی / شاعر: ظہیر احمد ظہیر / صفحات: 128 / قیمت: 300 روپے / تبصرہ نگار: ڈاکٹر نوید شہزاد

ناشر: مقصود پبلشرز، جیلانی سنٹر احاطہ شاہدریاں اردو بازار، لاہور

ظہیر احمد ظہیر کا نام اُردو شاعری کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن شاید اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ آپ حضرت ساغر صدیقی کے شاگرد ہیں۔ گو آپ بنیادی طور پر غزل گو ہیں مگر دوسری بہت سی اصناف سخن پر بھی برابر دسترس رکھتے ہیں۔ اسی کا ایک نمونہ ''خوشبوئے آ گہی'' ہے جو فن اور عقیدت کا نہایت خوبصورت امتزاج ہے میں انھیں خوشبوئے آ گہی کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب: دل زدہ / افسانہ نگار: ممتاز راشد لاہوری / صفحات: 168 / قیمت: 250 روپے / تبصرہ نگار: نوید مرزا

ناشر: رحمانیہ کتاب مرکز، لاہور

ممتاز راشد بھی کمال شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں کامیابی سے طبع آزمائی کے بعد نثری ادب میں بھی اپنے فن کا لوہا منوا لیا ہے۔ ''لاہور کے نئے پرانے رنگ'' اور ''بات کا بتنگڑ'' کے بعد ان کے افسانوی مجموعے ''دل زدہ'' کی اشاعت اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ نثری دنیا میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر رہیں گے۔ راشد کے افسانے مختصر نویسی کی عمدہ مثال ہیں۔ وہ کم لفظوں میں بڑی بات کہنا جانتے ہیں۔ ''دل زدہ'' میں راشد ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کے طور پر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے ان افسانوں میں علامات کا سہارا لینے کی بجائے سادگی اور بے ساختگی کا سہارا لیا ہے اور براہِ راست بات کرنے کو ترجیح دی ہے۔ میری نظر میں راشد کے افسانے ہمارے عہد کی عکاسی کرتے ہیں اور قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔

نام کتاب: تسلیوں کے حروف / مصنف: عامر شہزاد صدیقی / صفحات: 202 / قیمت: 350 روپے / تبصرہ نگار: عطاء الحق قاسمی

ناشر: الکتاب گرافکس، متصل جامع مسجد فاروق اعظم پل شوالہ چوک بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان

میرے نزدیک تخلیق کار کی تخلیق اور صنفِ تخلیق کے ساتھ اُس کی استواری بہت اہم ہے۔ ''شوقیہ فنکار'' اپنا اور قاری کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ عامر شہزاد صدیقی کی کالم نویسی کا سارا سفر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور مجھے اس کے کالموں کی تیسری کتاب ''تسلیوں کے حروف'' پڑھ کر دلی خوشی ہو رہی ہے کہ اُس نے اس میدان میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُس کا شمار اچھے کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جہاں اس نے عالمی اور ملکی صورت حال کے حوالے سے تخلیقی اور معلوماتی کالم لکھے ہیں۔ وہاں اپنے کالموں میں اپنے خطے سرائیکی وسیب خاص کر ملتان کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ اپنی دھرتی اور اپنے خطے کا قلم کار پر حق ہوتا ہے اور اس حق کو صاحب دل ہی پہچانتا ہے۔ مدینۃ الاولیاء میں رہنے والا تخلیق کار ہی ایسا صاحب دل ہو سکتا ہے۔ عامر شہزاد صدیقی بہت سے امور میں اختلاف کے باوجود اپنی تحریروں اور اپنی دل پذیر شخصیت کے باعث مجھے عزیز ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اسی طرح مستقل مزاجی کے ساتھ اندھیرے سے اُجالے کی جانب فکر و شعور کا قلمی سفر جاری رکھے گا۔ میں اُسے ''تسلیوں کے حروف'' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب: نیندر بھجیاں نظماں / شاعر: سلیم شہزاد / صفحات: 128 / قیمت: 300 روپے / تبصرہ نگار: ظفر اقبال

ناشر: بک ہوم، بک سٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور

سلیم شہزاد کا پہلا امتیاز وہ زندہ زبان ہے جو انھوں نے اپنی نظموں میں استعمال کی ہے اور جو یقینی طور پر ارتجاز ہونے سے کافی حد تک بچی ہوئی ہے اور ہمارے دیہات ہی میں پورے جوش و جذبے سے بولی جاتی ہے۔ بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ ہماری ماں بولی کو باقاعدہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی

ایک تو وہ جو شہروں میں آ کر اپنی تاب وتواں کھو بیٹھی ہے اور لازمی طور پر خون کی کمی کا شکار ہے اور دوسری وہ جو شہر کی ہوا لگنے سے بچ گئی ہے۔ سلیم شہزاد کی نظموں میں صحیح زبان کے علاوہ گہرائی اور پیچیدگی بھی دستیاب ہے جب کہ نظریاتی طور پر اس کا قبلہ بھی بظاہر درست لگتا ہے۔ نیز ابہام بجائے خود شاعری کا حسن ہے۔

نام کتاب: دُھند بھری حیرانی / شاعر: خاور وحید / صفحات: 128 / قیمت: 300 روپے / تبصرہ نگار: عامر سہیل

ناشر: بک ہوم، بک سٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور

خاور وحید ایسا باکمال اور باجمال شاعر ہے کہ شعری گدڑی پہن کر یہ شاعر بھی روحوں اور بے چین دلوں سے کلام کرتا ہے۔ اس کے مصرعوں اور غزل کا وار خالی نہیں جاتا۔ سہل ممتنع کا کمیاب شاعر، جس کی شاعری افسانوی جھرنوں سے ڈھلی ہوئی ہے اور پڑھنے والے کو سماوی کہاوت لگتی ہے۔ یہ شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کوئی چیز دھندلی نہیں، سب کچھ صاف وشفاف ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کے دل کی طرح۔ اس کے شعروں میں گداز، دردمندی، سادگی اور تاثیر زمانے اور اشک کو دل گیر کرتی ہے۔ میں خود اس کے شعروں کا اسیر ہوں۔

نام کتاب: آنکھ میں پانی رہنے دے / شاعر: آسناتھ کنول / صفحات: 200 / قیمت: 400 روپے / تبصرہ نگار: حسین مجروح

ناشر: بک ہوم، بک سٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور

آسناتھ کنول کی شاعری...... پوری آنکھ کی شاعری ہے۔ زندگی، انسان اور وقت اُس کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں جن کی تعمیر وتہذیب محبت کے پانی سے ہوئی ہے۔ تاہم آسناتھ کنول کے شعری اظہار میں محبت، محض ایک جذبہ یا رویہ نہیں بلکہ جذبوں کی وارفتگی، نسائی ایثار اور تخلیقی جرأت کے سبھی متعلقات کو پرو کر رکھنے والی مالا کا نام ہے۔ جس کا دانہ دانہ، اخلاص کی ڈوری میں بندھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سامنے کے موضوعات کو نظم کرتے وقت پس گرداب رونما ہونے والے حوادث کا ماجرا بھی اُسی سہولت سے رقم کرتی ہے جس طرح فکری معاملات میں روزمرہ کی کیفیات کا۔ ادب کے ایوان میں آسناتھ کنول کے رسمی داخلے پر مبارک باد دیتے ہوئے پورے خلوص سے اس امر کا متمنی ہوں کہ وہ حتی الوسع قبول عام کی آکاس بیل سے گریز کرے اور اپنے شعری ہنر کو ادب اور زندگی کے سچے طالب علم کی تلاش اور انہماک سے صیقل کرتی رہے۔ اپنے لہجے اور تخلیقی اظہار کو مستحکم کرنے کے لیے اسے بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں اور بنے بنائے رستوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک الگ راستہ بھی تراشنا ہے جہاں اُس کا تخن نئی نظم کے قارئین کو خیال اور خوشبو کا نیا جہانِ امکان کرے۔ میں یہ جہانِ فن نمودار ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں بشرطیکہ......

نام کتاب: پلکیں بھیگنے لگتی ہیں / شاعر: خالق آرزو / صفحات: 144 / قیمت: 300 روپے / تبصرہ نگار: سید ریاض حسین زیدی

ناشر: الاشراق پبلی کیشنز، ٹمپل روڈ، لاہور

تخلیق ایک خداداد صفت ہے جو شعر کی موزونیت لفظوں کی خوبصورت نشست و برخاست اور عناصر جہاں کی دل آویز ترتیب سے اپنے جواہر آشکار کرتی ہے۔ خالق آرزو نے اپنے انداز اور اپنے دائرہ کار میں شعری تخلیقات کے رنگوں سے بہار آفرینی کا سماں پیدا کیا ہے "رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" فراق، غم زدگی، ناانصافی، تلون مزاجی، بے حسی اور کم نظری کو دیکھ کر خالق آرزو نے ان منفی اقدار حیات کو کھری کھری سنائی ہیں۔ میں آج کے دور میں جن تخلیق کاروں میں مزاحمتی ردعمل کو نمایاں اور غالب حیثیت میں رونما ہوتا دیکھتا ہوں۔ خالق آرزو کا شمار بھی ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ نوآموز ہیں مگر دل کی بات بے ساختہ انداز میں کہنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ خالق آرزو فن کے تقاضوں کو مشاہدے کی پختگی اور مزید فنی حسن آفرینی سے مس خام کو کیمیا بناتے رہیں۔

نام کتاب: آنکھ میں سمندر/ شاعرہ: یاسمین کنول/ صفحات: 128 / قیمت: 200 روپے/ تبصرہ نگار: محمد شعیب مرزا

ناشر: فائن پبلی کیشنز، کمرہ نمبر 4، پہلی منزل، الحجاز پلازہ، 20 ایونگ روڈ، نیلا گنبد، لاہور

یاسمین کنول کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو کم وقت میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خامشی جب کلام کرتی ہے'' شائع ہوا تو اسے بے حد پذیرائی ملی۔ شعری مجموعے کے نام کے ساتھ ان کی شاعری بھی منفرد تھی۔ ''آنکھ میں سمندر'' بھی ایسی ہی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اُمید کی جاسکتی ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے کی طرح یہ بھی پذیرائی حاصل کرے گا۔ یاسمین کنول کی شاعری کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کی رائے ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''یاسمین کنول کی شاعری جذبات کا سیدھا اور سادہ اظہار ہے جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے اسے آسان لفظوں میں شعر میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتی ہیں۔ اس لیے مجھے ان کی شاعری اچھی لگی ہے۔ کیونکہ اس میں سچ کی خوشبو رچی بسی ہے۔ وہ فارسی اور عربی کی مشکل تراکیب استعمال کر کے اپنی علمیت کا رعب جھاڑنے والی شاعری نہیں کرتیں بلکہ ایسی شاعری کرتی ہیں جو قاری کے دل میں اُتر جائے اور مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے یکساں طور پر قابلِ مطالعہ ہو۔ ابصار عبدالعلی کا کہنا ہے کہ ''یاسمین کی فکر کا مثبت اور دردمندانہ اسلوب نہیں برتر انسان اور بہتر شاعر کے مرتبے کی جانب لے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اُمید اور محبت کی شاعرہ ہیں۔ یاسمین آسودگی کی تلاش میں ناآسودہ موسموں کی اسیر نظر آتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مزاج آشنا کے قرب کی تلاش میں ہر لحہ لامحدود فاصلوں اور تصور ناآشنا دوریوں کا سفر کر رہی ہیں۔'' اکرم سحر فارانی کے مطابق ''دلکش اسلوب، سلاست وروانی، ندرتِ خیال اور لطیف رومانی جذبات یاسمین کنول کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ مسرت اور سکونِ قلب کے احساس سے سرشار ہو کر شعر کہتی ہیں اور اپنے اشعار میں نمایاں تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو سادگی و شگفتگی کا لباس پہنا کر تصویریں بنانا اور انھیں زینتِ قرطاس کرنا جانتی ہیں۔ محمد شعیب مرزا کے بقول ''یاسمین کنول کی شاعری جذبات واحساس کی ہی نہیں روایات کی شاعری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات کے بہاؤ میں وہ اپنی روایات نہیں بھلاتیں اور اپنے اس شعر کو تفسیر دکھائی دیتی ہیں۔

نام کتاب: ڈاکٹر محمد وسیم انجم کی ادبی خدمات/ مصنف: قیصر آفتاب احمد/ صفحات: 288 / قیمت: 400 روپے/ تبصرہ نگار: ڈاکٹر عابد سیال

ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر ۳، راولپنڈی

ڈاکٹر وسیم انجم علمی ادبی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انھوں نے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے عمریں لگ جاتی ہیں۔ اپنی منصبی ذمہ داریوں کے حوالے سے وفاقی جامعہ اُردو، اسلام آباد کے شعبہ اُردو کے صدر ہونے کے ساتھ ساتھ اقبالیات کے میدان میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ہر دو حوالوں سے ان کی شہرت اور نیک نامی کی وجوہات میں سب سے نمایاں ان کی مسلسل محنت اور یکسوئی ہے۔ انھوں نے دنیا اور دنیاداری سے بے نیاز ہو کر اپنے کام کی طرف دھیان رکھا ہے اور سرخرو ہوئے ہیں۔ ان کا انکسار اس پر مستزاد ہے۔ لہٰذا علمی، ادبی، انتظامی، سماجی، اخلاقی ہر حوالے سے وہ ایک پسندیدہ شخصیت ہیں۔ دوستوں کے حلقے میں بھی اور ایک سینئر رفیق کار کے طور پر بھی ان کی ہر دلعزیزی روز افزوں ہے۔ ان کی گراں قدر خدمات بجا طور پر اس قابل ہیں کہ تجزیہ و تحقیق کے ذریعے ان کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔ جناب قیصر آفتاب (سابق ایم فل سکالر نار درن یونیورسٹی نوشہرہ اور حال پی ایچ ڈی سکالر نمل) نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور زیرِ نظر کتاب ان کی محنت کا ثمر ہے۔ کتاب ڈاکٹر وسیم انجم کی جملہ علمی وادبی خدمات کا احاطہ کرتی ہے اور اقبالیات، اُردو ادب اور تحقیق میں ان کے کارناموں کا تذکرہ اور تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ بطور مدیر و مرتب بھی ان کی کاوشوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ مصنف نے عمدہ اسلوب میں ایک لائقِ تحسین کام ہمارے سامنے رکھا ہے اور ہمارے شہر کے ایک ''ادب ستارے'' کو پہچاننے اور سمجھنے میں ان کی یہ کوشش یقیناً علمی وادبی حلقوں میں پذیرائی پائے گی اور ''ادبی انجم شناسی'' کی مثال ثابت ہوگی۔

نام کتاب: جھلک/ مصنف: محمد طفیل اعظمی/ صفحات: 176 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: محمد نوید مرزا

ناشر: رحمانیہ کتاب مرکز، الحمرا ٹاؤن، رائے ونڈ روڈ، لاہور

محمد طفیل اعظمی ہمارے معاشرے کے ایک باضمیر فرد ہیں۔ محبتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شاعری میں عصری مسائل، معاشرتی ناہمواریوں، ناانصافی اور عدم مساوات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ طفیل اعظمی کا طویل شعری سفر، ان کا تجربہ اور مشاہدہ انھیں زندگی کی تلخیوں اور خوش گوار لمحات دونوں کو آسانی سے بیان کرنا سکھاتا ہے۔ اُن کی شاعری میں روایت کا احترام بھی ہے اور جدتِ فکر بھی ہے۔

نامہ ہائے احباب

عزیز محترم عامر بن علی صاحب! اسلام مسنون

آپ کا ارژنگ مجھے باقاعدہ مل رہا ہے۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ معلوم نہیں پہلے ہی نہ بھیج دی ہو۔ آج کل "نوجوانی" نے برا حال کیا ہوا ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔ دُعائیں

سید مشکور حسین یاد

پیارے عیدرنگ حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ عید کی شیرینی میں ارژنگ کے حسن کی مٹھاس بھی کارفرما ہوئی۔ گوشت پکوان کی مناسبت آپ کے حسن کلام کی لذتیں بھی شامل حال رہیں۔ کیفیت یوں ہے کہ اب اکثر کسی بات پر دل نہیں جمتا۔ ہمارا پاکستان جسے دل و جاں کہیے دشمنوں سے نبرد آزما ہے۔ حادثوں اور سانحوں سے دوچار ہے۔ دعا یہی ہے کہ خدا اسلام کے اس قلعے پاکستان کی حفاظت کرے۔ سپہ سالار راحیل شریف کی مدد کرے تاکہ وہ دشمنوں کا قلع قمع کر کے ملک و قوم کے سامنے سرخرو ہوں۔ "ارژنگ کا آمنا سامنا" احباب کے عندیے میں لائق صد تحسین ہے۔ یہ سب الفاظ پس و پیش اور مضامین "حسن در پیش" (حسن عباسی) کا کرشمہ ہے۔ آپ کی محنت اور محبت مثالی ہے۔ آپ بقول لے سعی سے اکتاتے اور تگ و دو سے کنیاتے نہیں۔ "صیغہ مزاح" ذرا توجہ طلب ہے۔ عطاء الحق قاسمی مزاح میں دست و قلم ہیں مگر یہ کیا وہ ارژنگ کو "بچہ" سمجھتے ہیں۔ خیر آپ کو چوں و چگون سے کیا غرض۔ آپ عطاء الحق قاسمی کو دل کی سچائی سے دیکھتے ہیں میرے تو وہ اس لیے پیارے ہیں کہ انھیں احمد ندیم قاسمی سے از حد عشق ہے۔ اس میں کوئی لاگ لپٹ نہیں۔ آپ نے حمد "سائیں" کا بڑی عاجزی (عجز) اور انکسار سے اہتمام کیا ہے۔ اس کی بحر کے درد سے دل پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ میں نے بھی متاثر ہو کر اس زمین میں (آپ کی زمین) حمد کے چند شعر کہے ہیں۔ آپ کو بھیج کر یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی اس حمد سے موج در موج جذبات کا طوفان برپا ہوا جاتا ہے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

برادر محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے دبئی سے واپسی ہو چکی ہوگی۔ کامیاب دورہ پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

اکتوبر کے شمارے کے لیے "سلام" ارسال خدمت ہے۔ ہو سکے تو شامل کر دیجیے گا۔ شکریہ

اوکاڑوی صاحب و دیگر دوستوں کو سلام۔

برادر عزیز

ریاض حسین زیدی

سبی

جناب محترم عباسی صاحب!

بہت ساری دُعائیں!! بخیریت ہوں۔

"ارژنگ" کے شماروں نے اچانک جلوہ نمائی بند کر دی ہے۔ بڑی تکلیف ہے۔ ادبی پرچوں میں "ارژنگ" منفرد اہمیت کا حامل پرچا ہے۔ مگر ہم لوگ محروم ہونے والوں میں پیش پیش جانے کیوں؟ اُمید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ محبت کا سلوک فرمائیں گے۔

ارژنگ کے لیے ایک اور افسانہ حاضر خدمت ہے۔ بعنوان "جیالا" اُمید ہے کہ آپ "ارژنگ" کے دوستوں تک پہنچانے میں میری معاونت فرمائیں گے۔ باقی سب خیریت ہے۔ مفصل بات پھر ہوگی۔ انشاءاللہ

گل زیب عباسی

ڈونگا بونگا ضلع بہاولنگر

جناب ناز صاحب! ایک حمد اور ایک نعت بھیج رہا ہوں میرا مان درمیان۔

ارژنگ کے اگلے شمارے میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔

رشید شاہد

ننکانہ صاحب

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

آنجناب! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ کسی جگہ "ارژنگ" دیکھا۔ پسند آیا۔ اُمید ہے تبصرہ کتب میں جگہ دیں گے۔ اگر آپ ارژنگ کی ایک کاپی ارسال فرمادیا کریں تو میں زرسالانہ بھجوادوں گا۔

خیر اندیش

خالق آرزو

ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار
حسن عباسی
کا پہلا حمدیہ شعری مجموعہ

سائیں

شائع ہو گیا ہے

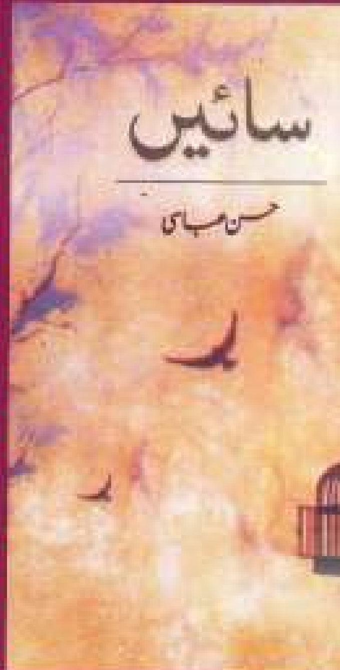

اپنی وقت گزاریاں سائیاں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں
•
دیکھ کے تیرے جلوے سائیں
میں واری میں صدقے سائیں
•
تیری جھلک کیا دیکھی سائیں
اپنی ہو گئی چھٹی سائیں
•
میں ہوں کچا کوٹھا سائیں
مار کسی دن پوچا سائیں
•
جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اسی کی کمائیاں سائیں

حسن نے میرے اور آپ کے رب کو جس نظریے سے دیکھا ہے اور اس حوالے سے جو شاعری کی ہے وہ حمدیہ روایت سے مکمل طور پر ہٹ کر ہے۔ حسن کا خدا بھی اس کے محبوب کی طرح میرے اور آپ کے محبوب سے جدا ہے۔ یہ حمد پڑھتے ہوئے بھی میں بیک وقت ایک روحانی اور رومانی تجربے سے گزرا۔ یہ ایک عجیب نظم ہے اور مجھے یقین ہے حسن کو یہ نظم دونوں جہانوں میں زندہ رکھے گی۔

عطاء الحق قاسمی

حسن عباسی نے "سائیں" میں متضاد کیفیات کی نازک پچی کاری سے حمد کا ایک ایسا بے مثل موزیک ترتیب دیا ہے...... کہیں عجز کی پاس داری کا رنگ ہے تو کہیں انا کی آب داری کی دمک۔ کہیں گریز، احتیاط اور حزن کی گراں باری ہے تو کہیں تجاوز، اصرار اور بے ساختگی کی تیز گفتاری اور یہ سب کچھ یک جان ہو کر ایک ایسے انوکھے کی نمو کی اساس بن گیا ہے، جس کی کوئی مثال شاید اردو کی حمدیہ شاعری میں اس سے پہلے موجود نہیں۔

غلام حسین ساجد

حسن عباسی کا حمدیہ دیوان "سائیں" ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ یہاں نقاشِ ازل کے روبرو ہونے کی بجی سنسنی ملتی ہے اور خدا سے تخاطب بندگانہ اُس پہلو دار پارۂ الماس کی طرح لو دیتا ہے، جس میں مختلف اور متضاد رنگوں کی چھوٹ ایک دوسرے پر پڑتی ہے اور ایک ایسے آئینہ خانہ میں لے جاتی ہے جہاں شاعر کا وفورِ احساس قاری میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ ان تو بہ تو رنگوں میں کہیں بے مائیگی کا احساس ہے کہیں نارسائی کی کسک، کہیں عجزِ ادراک کی جھلک ہے اور کہیں شرفِ انسانی کا وہ طنطنہ جس میں چھوٹے منہ سے بڑی بات بھی نازیبا معلوم نہیں ہوتی۔ گستاخی و بے باکی میں محبت کی رمزیں جھلکنے لگتی ہیں اور حسنِ ادا سے شکوہ، شکر میں ڈھل جاتا ہے۔

خورشید رضوی

حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ کلام ایک نادر حمدیہ شعری تجربہ ہے جس نے مجھے ایک حیرت انگیز سرخوشی سے معمور کر دیا...... ایک والہانہ پن ہے جو حسن عباسی کے حمدیہ اشعار میں بے ساختگی کے ساتھ پھلتا پھولتا آگے کی جانب اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے...... حسن عباسی حمد گزاری کے اس عمل میں خود بھی ایک نئی لذتِ اظہار سے آشنا ہوئے اور وہ اپنے قارئین کو بھی اس مزاج آشنا بنانا چاہتے ہیں۔ میں حسن عباسی کو اس کے اس بیش قیمت حمدیہ مجموعے پر مبارک باد دیتے ہوئے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتا ہوں۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

حسن عباسی نے ایسی دھلی دھلائی اُجلی لفظیات استعمال کیں کہ پڑھتے ہوئے کورے برتن کی سوندھی سوندھی خوشبو دماغ تک جاتی محسوس ہی نہیں ہوتی نظر بھی آتی ہے۔ اُڈاریاں، سنگھ مہار، ساجھے داریاں، دانگیاں، چھلے، جھوک، جگنی، کچا کوٹھا، پوچا، پیار ادریکا کوتی، پچھائیں اور ایسے بے شمار لفظ نگینوں کی طرح ہوتے ہیں، چمکدار الفاظ کر دل میں اُترتے جائیں اور اردو کے غزل پر کھڑا رہے ان چھوٹے پھول سے کھلتے جائیں۔ خالدا سہیل احمد خان نے سہیل بارش کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری زندگی کے متنوع تجربوں سے جھلک رہی ہے۔ یہ قول "سائیں" پر بھی صادق آتا ہے۔

محمد اظہار الحق

ناشر
نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-37351963
nastalique786@gmail.com

الحمراء ادبی بیٹھک اور ادارہ وجدان کے زیرِ اہتمام

حسن عباس رضا کے شعری مجموعے "عشق بدوش" کی تقریب رونمائی

صدارت • عطاء الحق قاسمی • مہمانانِ خصوصی • ڈاکٹر کامران • غلام حسین ساجد

مہمانانِ اعزاز • عامر بن علی • علی اکبر عباس • نظامت • ڈاکٹر صغرا صدف

عطاء الحق قاسمی کا عامر بن علی کے اعزاز میں عشائیہ

Design By:
Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com